سورۃ المومنون

نام:

اس سورت کا نام اَلْمُؤْمِنُوْنَ ہے اور اس میں 6 رکوع اور 118 آیتیں ہیں۔ اس کا نام اَلْمُؤْمِنُوْنَ پہلی ہی آیت میں آتا ہے، جہاں یہ بتایا کہ مومنوں کی کامیابی کا انحصار کن باتوں پر ہے۔ اور اسی لحاظ سے یعنی یہ بتانے کو کہ مومن اپنی کامیابی صرف دنیوی ترقی کو نہ سمجھیں۔ اس سورت کا یہ نام رکھا ہے۔

خلاصہ مضمون:

① پہلے رکوع میں بتایا ہے کہ مومنوں کی فلاح کن امور میں ہے، اور سمجھایا ہے کہ فلاح یا کامیابی کی بنیاد اخلاق فاضلہ پر رکھنی چاہئے۔ رہا یہ کہ اپنے دشمنوں سے نجات ملے اور ایک قوم دنیوی رنگ میں بھی کامیاب ہو تو ② حضرت نوح علیہ السلام کا دوسرے رکوع میں اور آپ کے بعد کے انبیاء کا ③ تیسرے رکوع میں ذکر کر کے بتایا کہ یہ بھی ان لوگوں کو میسر آجاتا ہے جو اپنی فلاح کا مدار اخلاق پر رکھتے ہیں۔ ④ چوتھے رکوع میں پھر صفائی سے بتایا کہ فلاح حصول مال و دولت سے نہیں بلکہ اخلاق فاضلہ اور تعلق باللہ سے ہے۔ ⑤ اس لحاظ سے پانچویں رکوع میں اثبات توحید اور ابطال باطل کیا ⑥ اور چھٹے میں بتایا کہ اعدائے حق کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ وہ غلط راہ پر چلتے ہیں۔

تعلق:

پچھلی سورت میں بتایا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی دیگر انبیاء کی طرح کامیاب ہوں گے مگر اس کے لیے جنگیں کرنی پڑیں گے جن میں وہ فاتح ہوں گے۔ مگر اس لیے کہ فتوحات اور بادشاہت اور مال و دولت کو کامیابی نہ سمجھ لیں، یہاں یہ بتایا ہے کہ مومنوں کی فلاح کن باتوں میں ہے۔

زمانۂ نزول:

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور مضمون کے لحاظ سے مکہ کے آخری زمانہ میں رکھی جا سکتی ہے۔

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ مَكِّيَّةٌ (74) (23) اٰيَاتُهَا 118 رُكُوْعَاتُهَا 6

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ — مومن یقیناً کامیاب ہیں۔ (2248)

2248۔ **ترقی کی بنیاد اخلاق پر ہے:** اس رکوع میں مومنوں کی فلاح یا کامیابی کا ذکر ہے۔ فلاح میں کیا کیا امور شامل ہیں [دیکھو نمبر: 16]۔ اور اس فلاح کے لیے مومنوں میں چند صفات کا موجود ہونا ضروری ٹھہرا دیا گیا ہے۔ اور وہ صفات کیا ہیں۔

① صلوٰۃ یعنی رجوع الی اللہ۔

② ان باتوں اور کاموں سے اجتناب جن کا اثر انسانوں کی ترقی اور بہتری پر اچھا نہیں۔

③ ہر ایک فعل میں پاکیزگی یا قوائے انسانی کے نشوونما کو مدنظر رکھنا۔

④ قوائے شہوانی پر پورا غلبہ حاصل کرنا۔

⑤ امانتوں اور عہد کی پابندی۔

⑥ نمازوں پر محافظت۔

پس فلاح قومی کو اللہ کا کلام اخلاقی ترقی سے وابستہ کرتا ہے۔ مومنوں کو بلاشبہ وہ سب مشکلات پیش آنے والی ہیں جو دنیا میں قوموں کو پیش آتی ہیں۔ لوگ ان کے مخالف اور دشمن ہوں گے، ان کو ظلم سے کچلنا چاہیں گے، ان کو لڑائیاں کرنی پڑیں گی، ان کو مختلف قوموں اور مذاہب سے واسطہ پڑے گا، انہیں دنیوی رنگ میں اپنی تجارتوں وغیرہ کا فکر کرنا ہوگا۔ مگر ان کی قومی ترقی کی جڑ ان کی فلاح کا سنگ بنیاد اخلاق میں بلند مرتبگی کو قرار دیا گیا۔ اگر وہ اخلاق فاضلہ پر قائم ہوں گے تو باقی صفات جن سے دنیا میں قومیں ترقی کرتی ہیں خود بخود ان میں پیدا ہو جائیں گی۔ گو دشمن انہیں کچلنا چاہے گا مگر انہیں ان تجاویز کے سوچنے کی ابھی ضرورت نہیں جن سے دشمن کو زک پہنچ سکے۔ گو انہیں جنگ کرنی پڑے گی، مگر انہیں فن جنگ سیکھنے اور سامان حرب اکٹھا کرنے کی ابھی ضرورت نہیں۔ ان کی پہلی ضرورت اخلاق میں ترقی، رجوع الی اللہ، لغو سے بچنا، شہوات پر حکمرانی، امانت اور عہد کا پورا کرنا ہے۔ دنیا کی کسی کتاب نے قومی ترقی کا یہ راز نہیں بتایا جو قرآن شریف نے بتایا۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ اس بنیاد پر جو عمارت بنی وہ کیسی مضبوط بنی۔ قرآن کریم کا ایک طرف مسلمانوں کی فلاح کے لیے ان صفات کو ضروری ٹھہرانا اور دوسری طرف آنحضرت ﷺ کے ساتھیوں کی فلاح کی بار بار پیشگوئیاں کرنا صاف بتاتا ہے کہ یہ سب صفات نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں پائی جاتی تھیں۔ اور یہ وہ انقلاب تھا جو آپ کی قوت قدسی سے ملک عرب کے رہنے والوں میں پیدا ہوا۔ جن کی پہلی حالت ان سب باتوں کے خلاف تھی۔ اور ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾﴾ کے آگے جو مومنوں کی تصویر کھینچی ہے وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾ جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔ (2249)

وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ﴿۳﴾ اور جو لغو سے منہ پھیرنے والے ہیں۔ (2250)

زندگیوں کا ہی نقشہ ہے۔ اسی سے محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے حالات کا اندازہ کرلو۔

2249- خَشُوع سکون اور فرمانبرداری، عاجزی کی حالت کا نام ہے۔ نماز میں خشوع سے مراد کیا ہے؟ خائف اور سکون کی حالت میں ہونا، آنکھ کا نیچا رکھنا، سر کا جھکا ہوا ہونا وغیرہ۔ مختلف معنی لیے گئے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ سب باتیں اس میں شامل ہیں۔ اور نماز میں سکون یہی ہے کہ نماز کے سوائے اور کسی چیز کی طرف توجہ نہ ہو۔ جب یہ حالت ہوگی تو قلب میں بوجہ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے کے احساس کے اس مقام کی پوری عظمت ہوگی اور جوارح خود ہی سب سکون کی حالت میں ہوں گے۔ نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنا یا کپڑوں یا اپنے جسم کے کسی حصہ سے لغو حرکتیں کرنا یا اسے جلدی جلدی بیگار کی طرح ادا کرنا سب نماز میں خشوع کے خلاف ہیں۔ اور مومن کے لیے نماز میں خشوع اس کی روحانی ترقی کا پہلا قدم ہے۔ اسلام نے صلوٰۃ یا رجوع الی اللہ کو تمام اخلاق فاضلہ کی جڑ قرار دیا ہے اس لیے کہ خلوص جو تمام اخلاق فاضلہ کی جڑ ہے وہ کبھی کسی قوم میں یا کسی انسان میں سوائے خدا سے تعلق کے پیدا نہیں ہوسکتا۔ اور جب تک تمام اخلاق اور معاملات میں خلوص نہ ہو اس وقت تک اخلاق فاضلہ کا نام بھی ان کو نہیں دیا جاسکتا۔ اور اسی لیے یہاں محض نماز پڑھنا نہیں رکھا بلکہ نماز میں خشوع رکھا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت کا اثر جب تک دل پر پیدا نہ ہو کچھ فائدہ نہیں۔

2250- لَغْوِ [دیکھو نمبر: 288] ایسا کلام جو غور و فکر سے نہیں کیا جاتا۔ اور لَغَا چڑیا اور پرندوں کی آواز کو کہتے ہیں اور قبیح بات کو بھی لغو کہہ دیا جاتا ہے۔ ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا تَاْثِيْمًا ۙ﴾[الواقعة: 25:56] ''وہ اس میں کوئی لغو بات نہ سنیں گے اور نہ کوئی گناہ کی بات۔'' ﴿وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝﴾[الفرقان: 72:25] ''اور جب لغو پر گزرتے ہیں بزرگانہ طور پر گزر جاتے ہیں۔'' اور لَا غِيَةً بھی لغو کے معنی میں ہی ہے ﴿لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ۝﴾[الغاشية: 11:88] ''تو اس میں کوئی لغو بات نہ سنے گا۔'' اور اسی سے لُغۃ ہے۔ (غ) اور لغو میں بے حقیقت اقوال اور افعال دونوں شامل ہیں۔ (ر)

اخلاقی اور روحانی ترقی میں لغو سے اعراض کو دوسرا مرتبہ قرار دیا ہے۔ اور اس سے مراد نہ صرف لغو باتیں ہیں بلکہ لغو کام بھی، جن میں اکثر لوگ مبتلا رہتے ہیں۔ اور اس زمانہ کی تہذیب کے خاص اشغال میں سے ہیں۔ سلمان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے [اِيَّاكُم وَ مَلْغَاةُ أَوَّلِ اللَّيْلِ] (کنزالعمال: جلد7، صفحہ 387) یعنی ''اول شب میں لغو باتوں سے بچو۔'' (ل) اگر دیکھا جائے تو آج کل مسلمانوں نے دوسروں کی نقل کرکے اول شب کی لغو باتوں کو دنیا جہان کی ضروریات میں سب پر مقدم کیا ہوا ہے۔ ہنسی اور ٹھٹھے اور عیب چینی اور غیبت کی مجلس جمتی ہے تو آدھی رات گزر جاتی ہے۔ ایسی حالت میں شب بیداری تو ایک طرف رہی نماز فجر کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ ایسا ہی تاش وغیرہ کے اشغال ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کو چارپایوں کی زندگی سے بڑھ کر بلامقصد بنا دیا اور قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ کوئی ایسا فعل یا کلام نہ کیا جائے جس میں انسان یا نسل انسانی کی

وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ﴿۴﴾ اور جو پاکیزگی کے لیے کام کرنے والے ہیں۔ (2251)

وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ﴿۵﴾ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ﴿۶﴾ مگر اپنی بیویوں سے یا ان سے جن کے ان کے داہنے ہاتھ مالک ہوئے، تو وہ ملامت نہیں کیے گئے۔ (2252)

بہتری مدنظر نہ ہو۔ پس کہاں تعلیم قرآن اور کہاں موجودہ مسلمانوں کا عمل۔

2251- **زکوٰۃ بمعنی تزکیہ:** زَکٰوۃ کے لیے [دیکھو نمبر: 1947 و 1981] یہاں مراد تزکیہ ہے۔ لِلزَّکٰوۃِ میں لام علت کا ہے، یعنی جو وہ کرتے ہیں اس غرض سے کرتے ہیں کہ ان کے نفس کا تزکیہ ہو۔ (غ) اور اگر ادائیگی زکوٰۃ مراد ہوتی تو فٰعِلُوْنَ کا لفظ یہاں نہ لایا جاتا۔ اس لیے کہ [فُعِلَتِ الزَّکٰوۃُ] نہیں کہتے۔ اور یہاں زکوٰۃ کے معنی مصدری یعنی تزکیہ ہی ہیں۔ (ر) اور سیاق بھی اسی معنی کو چاہتا ہے۔ اس لیے کہ یہ تیسرا مرتبہ انسانی ترقی میں ہے۔ پہلا مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکنا اور اس سے تعلق پیدا کرنا، دوسرا یہ کہ انسان اپنے اوقات کو لغو باتوں اور لغو کاموں سے بچائے اور لغو سے وقت کو بچانا خود چاہتا ہے کہ اسے کسی بہتر مصرف پر لگایا جائے۔ پس اب وہ مصرف بتایا کہ تزکیہ کو اپنے ہر ایک فعل کی غرض رکھے اور تزکیہ سے مراد صرف پاکیزگی اپنے عام معنوں میں نہیں بلکہ اس کے معنی ہی نفس کو خیرات و برکات سے ترقی دینا ہیں۔ [دیکھو نمبر: 164] وغیرہ۔ پس کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے اوقات کو ایسے مصرف میں لگایا جائے جس میں انسان کی اپنی یا اس کی قومی بہتری مدنظر ہو۔

2252- فُرُوج۔ فَرْج کی جمع ہے اور وہ اصل میں دو چیزوں کے درمیان شگاف کو کہتے ہیں۔ اور مراد اس سے وہ ہے جو دونوں پاؤں کے درمیان ہے۔ اور شرمگاہ کے لیے اس کا استعمال بوجہ کثرت صریح کے طور پر ہو گیا ہے۔ اور ہر ایک موضع مخافت کو یعنی جہاں سے کوئی خوف ہو فَرْج کہا جاتا ہے۔ (غ)

حفظِ فروج سے مراد:

حفظ فروج تو فی الحقیقت وسیع معنی میں ہے۔ یعنی ہر ایک موضع مخافت کا یعنی ایسے مقام کا جہاں سے شیطان حملہ آور ہو سکتا ہے، محفوظ رکھنا۔ مگر یہاں ازواج کا استثنا بتاتا ہے کہ مراد ایسے مواضع مخافت ہیں جو قوت شہوانیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن مراد صرف زنا سے بچنا نہیں بلکہ شہوات کے تمام موقعوں سے اپنی حفاظت کرنا ہے۔ یہاں تک کہ بدنظری سے بچنا بھی اس میں داخل ہے۔ اس لیے جس طرح مردوں کو حفاظت فروج کا حکم ہے عورتوں کو بھی ہے ﴿وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ﴾ [الأحزاب: 35:33] ''اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔'' لیکن یہاں استثنا میں ﴿اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ سے ایک دقت پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ کہ زوج سے مراد تو مرد کی صورت میں اس کی بی بی اور عورت کی صورت میں اس کا خاوند ہیں اور ﴿اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ﴾ میں غلام اور لونڈی دونوں داخل ہیں۔ سوائے اس

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۙ﴿۷﴾

لیکن جو اس سے آگے نکلنا چاہیں وہ حد سے بڑھنے والے ہیں۔

وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ﴿۸﴾

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں۔ (2252)

وقف لازم وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ﴿۹﴾

اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ (2253)

کے کہ قرینہ اسے غلاموں سے مخصوص کرے یا لونڈیوں سے۔ اب یہاں بظاہر کوئی ایسا قرینہ نہیں، لیکن اجماع نے مرد مملوک سے آزاد عورت کا تعلق بغیر نکاح ناجائز ٹھہرایا ہے اور زن مملوکہ سے آزاد مرد کا تعلق جائز رکھا ہے۔ اس لیے ﴿اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ﴾ سے یہاں صرف لونڈیاں مراد لی ہیں۔ مگر یہ سوال الگ ہے کہ لونڈی کے ساتھ تعلق بذریعہ نکاح ہوسکتا ہے یا بغیر نکاح۔ سو اس پر [نمبر: 605 ، 639] میں مفصل بحث گزر چکی ہے۔

انسانی ترقی کا یہ چوتھا مرتبہ ہے جو قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے۔ اور اس کا منشا یہ ہے کہ انسان کے قوائے شہوانی جو اسے قدرت نے دیئے ہیں ان پر اس کو پوری حکومت حاصل ہو۔ یہ وہ بات ہے جس کی طرف سے اکثر قوموں نے غفلت کی ہے اور یہی آخر کار ان کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ قوائے شہوانی کو جب تک حد اعتدال کے اندر نہ رکھا جائے یہ تمام دوسری قوتوں کو دبا لیتے ہیں اور ان کا ہیجان آہستہ آہستہ انسانوں کو اور قوموں کو بڑے بڑے اخلاق فاضلہ سے عاری کر دیتا ہے۔ آج بھی کس قدر قومیں ہیں جو اپنے آپ کو مہذب اور ترقی یافتہ سمجھتی ہیں مگر قوائے شہوانی کی غلامی کی طرف ان کا قدم اٹھ رہا ہے۔ اور وہ نہیں جانتیں کہ وہ ہلاکت کے گڑھے کے قریب ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

2252- یہ ترقی کا پانچواں مرتبہ ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی مدعی تہذیب قوموں کی حالت کو مدنظر رکھ کر ہی یہ علاج بتائے گئے ہیں۔ جب ایک قوم دنیوی ترقی کے معراج پر پہنچتی ہے تو پھر اسے امانت اور عہد کی کوئی پروا نہیں رہتی۔ اس لیے کہ وہ زبردست ہے اور جو چاہے کر سکتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ امانت اور عہد کے عدم ایفا سے قوموں کا اعتماد اٹھ جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساتھ ہی ان کا رعب جاتا رہتا ہے، اور رعب کے بغیر کوئی مادی قوت کچھ کام نہیں دیتی۔

2253- چھٹے اور آخری مرتبہ پر نمازوں کی محافظت رکھی ہے اور اسی طرح سورۂ المعارج میں بھی آخری مرتبہ نمازوں کی محافظت کو ہی رکھا ہے اور اس سے مراد جیسا کہ [نمبر: 307] میں دکھایا گیا ہے صرف اوقات و ارکان کی حفاظت ہی نہیں بلکہ ہر ایک فحشا اور منکر سے بچنا بھی ہے اور نماز یا خدا کی طرف رجوع ایسے انسان کے لیے بطور ایک غذا کے بن جاتا ہے، جس کے بغیر اسے چین نہیں پڑتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ نماز کو مومن کا معراج کہا ہے۔ کیونکہ اس کی ترقی کا آخری مرتبہ بھی یہی ہے۔ جب انسان اس

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۙ﴿۱۰﴾ یہی وارث ہیں۔

الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱﴾ جو فردوس کو ورثہ میں لیتے ہیں، وہ اسی میں رہیں گے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔(2254)

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ پھر ہم نے اسے ایک مضبوط ٹھہرنے کی جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا۔

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ پھر ہم نے نطفہ کو لوتھڑا بنایا اور لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا بنایا۔ اور گوشت کے ٹکڑے میں ہڈیاں بنائیں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم نے اسے ایک اور

مرتبہ کو حاصل کرتا ہے تو اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ کمال کو پہنچ جاتا ہے اور بلند سے بلند اخلاق والے لوگ دنیا میں مادی ترقی کے لیڈر نہیں بلکہ وہ روحانی پیشوا ہوئے ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ کامل ہوا ہے۔ اور تمام دنیا کی اقوام انہی لوگوں کے نقش قدم پر چلنے کا دعویٰ کرتی ہیں۔

2254- ﴿سُلٰلَةٍ﴾۔ سَلّ ایک چیز کا دوسری سے کھینچ کر نکال لینا ہے۔ اور سُلٰلَةٍ وہ صاف جوہر ہے جو زمین سے کھینچ کر نکال لیا جاتا ہے۔ (غ)

انسان مٹی سے کس طرح بنتا ہے:

قرآن کریم میں کئی جگہ انسان کو مٹی سے پیدا کرنے کا ذکر ہے۔ لیکن جہاں اس کی تصریح فرما دی اور بتا دیا کہ مٹی کا بت نہیں بنایا جاتا بلکہ اس کا خلاصہ نکالا جاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت پر دلالت کرتا ہے کہ ایسے کثیف جوہر سے جیسے مٹی ہے وہ نہایت لطیف جوہر پیدا کرتا ہے جس سے انسان کی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے اور جسے کوئی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ پس جب مٹی جیسی کثیف چیز سے اللہ تعالیٰ زندگی کے جوہر کو نکالتا رہتا ہے اور یہ نظارہ دن رات ہماری آنکھوں کے سامنے ہے تو اعمال سے اس سے بھی لطیف تر ایک جوہر کیوں نہیں بن سکتا، جو انسان کی دوسری زندگی کے لیے بطور ایک بنیاد کے ٹھہرے۔

خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾

پیدائش دے کر اٹھا کھڑا کیا۔ پس اللہ بابرکت ہے (جو) سب بنانے والوں سے بہتر (ہے)۔ (2255)

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾

پھر تم اس کے بعد یقیناً مرنے والے ہو۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾

پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَ مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾

اور ہم نے تمہارے اوپر سات رستے بنائے اور ہم مخلوق سے بے خبر نہیں۔ (2256)

2255- جسمانی زندگی کے مدارج کو روحانی زندگی کے مدارج پر بطور شہادت کے پیش کیا ہے۔ اور یہاں بھی چھ ہی مدارج بیان فرمائے ہیں۔ اور ﴿اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ﴾ میں نفس ناطقہ یا عقل انسانی کے دینے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی بتایا ہے کہ انسان کی زندگی کی ترقیات کو ہم نے محض حیوان کی زندگی کی ترقیات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے کوئی چیز زائد بھی دی ہے جو اس کے اعمال کے محاسبہ اور بعثت کو ضروری ٹھہراتی ہے۔ اسی لیے اس کے بعد اس کی موت کے ساتھ اس کی بعثت کا ذکر کیا۔

2256- **سات رستے اور نظام شمسی:** سات رستوں کی توجیہ مفسرین نے یوں کی ہے کہ وہ سات آسمان ہیں اور رستے انہیں اس لیے کہا ہے کہ فرشتوں کی آمد و رفت ان میں ہے یا کواکب ان میں چلتے ہیں۔ مگر طَرِيْقَةٌ اس چیز کو نہیں کہتے جس میں کوئی رستہ بھی ہو۔ یوں تو زمین بھی طریقہ ہوئی کیونکہ اس میں ﴿سُبُلًا فِجَاجًا﴾ ہیں۔ بلکہ طریقہ خود رستہ کو کہتے ہیں۔ اور یہاں صرف طریقوں کا ذکر ہے۔ دوسرے قرآن کریم نے خود بتا دیا ہے کہ وہ چلنے والے کون ہیں۔ ﴿وَ السَّمَآءِ وَ الطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾﴾ [الطارق: 86:1-3] ''آسمان گواہ ہے اور رات کو آنے والا۔ اور تجھے کیا خبر ہے کہ رات کو آنے والا کون ہے۔ چمکتا ہوا ستارہ ہے۔'' اور نجم ثاقب زہرہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جن کے یہ رستے ہیں ان میں سے ایک چلنے والا زہرہ ہے اور باقی بھی اسی کے ساتھ کے دوسرے کواکب ہیں جو زمین کے علاوہ نظام شمسی میں سات ہیں۔ پس انہی سات کے رستوں کو سبع طرائق کہا ہے نہ آسمانوں کو۔ ہاں سبع سماوات کا لفظ خود ان سات سیاروں پر اس لحاظ سے صادق آتا ہے کہ وہ اوپر ہیں۔ اور ﴿مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾﴾ اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنا علم بیان فرما رہا ہے اور ان اجرام فلکی کی طرف اس لیے توجہ دلائی کہ انسان کی پیدائش کیا حقیقت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنے اتنے بڑے اجرام بھی پیدا کیے ہیں اور ممکن ہے کہ ﴿مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾﴾ میں یہ اشارہ ہو کہ ان اجرام میں جو مخلوق ہے ہم اس کی بھی خبر گیری کرتے ہیں۔

وَ اَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسۡکَنّٰہُ فِی الۡاَرۡضِ ٭ۖ وَ اِنَّا عَلٰی ذَہَابٍۭ بِہٖ لَقٰدِرُوۡنَ ﴿ۚ۱۸﴾

اور ہم نے بادل سے ایک اندازہ سے پانی اتارا۔ پھر اسے زمین میں ٹھہرایا، اور ہم اسے اٹھالے جانے پر بھی قادر ہیں۔ (2257)

فَاَنۡشَاۡنَا لَکُمۡ بِہٖ جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّ اَعۡنَابٍ ۘ لَکُمۡ فِیۡہَا فَوَاکِہُ کَثِیۡرَۃٌ وَّ مِنۡہَا تَاۡکُلُوۡنَ ﴿ۙ۱۹﴾

وقف لازم

پھر ہم نے اس کے ساتھ تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اگائے، ان میں تمہارے لیے بہت پھل ہیں اور ان سے تم کھاتے ہو۔

وَ شَجَرَۃً تَخۡرُجُ مِنۡ طُوۡرِ سَیۡنَآءَ تَنۡۢبُتُ بِالدُّہۡنِ وَ صِبۡغٍ لِّلۡاٰکِلِیۡنَ ﴿۲۰﴾

ایک درخت جو سینا پہاڑ سے نکلتا ہے وہ روغن اور کھانے والوں کے لیے سالن لیے ہوئے نکلتا ہے۔ (2258)

وَ اِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً ؕ نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِہَا وَ لَکُمۡ

اور تمہارے لیے چار پایوں میں بھی عبرت ہے۔ ہم تمہیں اس سے پلاتے ہیں جو ان کے پیٹوں میں ہے اور ان

2257- پانی کے لے جانے سے مراد اس کا زمین میں کم کر دینا بھی ہوسکتا ہے اور اس کا اوپر بخارات کی صورت میں اٹھا کر لے جانا بھی۔ سیاق کی رو سے دوسرے معنی کو ترجیح ہے۔ کیونکہ یہاں صرف نعمتیں دینے کا ذکر ہے۔

2258- ﴿سَیۡنَآءَ﴾۔ سینا اور سِیۡنِیۡنَ شام میں ایک مشہور پہاڑ ہے۔ (ل) اور بعض نے اس کے معنی مبارک کیے ہیں اور بعض نے درختوں والا۔ (ج) اور اس کا وہ پہاڑ ہونا جس پر سے موسیٰ علیہ السلام پکارے گئے مشہور ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ پہاڑ ہے جس پر سے آنحضرت ﷺ پکارے گئے۔ (ج)

دُہۡنٍ روغن کو کہتے ہیں۔ اور صِبۡغٍ سالن کو۔ اس لحاظ سے کہ کھانا کھانے والا روٹی کو سالن میں ڈبو کر کھاتا ہے۔ [دیکھو نمبر: 173]

یہ درخت زیتون ہے۔ (ج) اور اس کے الگ ذکر میں حالانکہ اوپر بارش کے ساتھ باغ وغیرہ لگانے کا ذکر ہے اشارہ اس طرح معلوم ہوتا ہے۔ ﴿یُّوۡقَدُ مِنۡ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیۡتُوۡنَۃٍ لَّا شَرۡقِیَّۃٍ وَّ لَا غَرۡبِیَّۃٍ﴾ [النور: 35:24] ''(چراغ) ایک بابرکت زیتون کے درخت سے روشن ہو رہا ہے، جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔'' جہاں اسلام کو درخت زیتون سے تشبیہ دی ہے اور بعض احادیث میں زیتون کی تعریف بھی بہت آئی ہے۔

فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾

میں تمہارے لیے بہت فائدے ہیں اور ان سے تم کھاتے ہو۔

وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ ع 1 22 1

اور ان پر اور ان کشتیوں پر تم سوار ہوتے ہو۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، سو اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں۔ تو کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۖۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ ج

تو ان لوگوں کے سرداروں نے جو اس کی قوم میں سے کافر ہوئے کہا یہ صرف تم ہی جیسا ایک بشر ہے۔ چاہتا ہے کہ تم پر بڑائی حاصل کرے اور اگر اللہ چاہتا تو فرشتے اتار دیتا۔ ہم نے یہ پہلے اپنے باپ دادوں میں نہیں سنا۔ (2259)

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾

وہ صرف ایک ایسا شخص ہے جسے جنون ہے۔ تو ایک وقت تک اس کے بارے میں انتظار کرو۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾

(نوح نے) کہا میرے رب مجھے مدد دے اس لیے کہ انہوں نے مجھے جھٹلایا۔ (2260)

2259- ﴿يَّتَفَضَّلَ﴾۔ تَفَضُّل یہ ہے کہ اپنے ہمسروں پر فضیلت کا دعویٰ کرے۔ یعنی وہ چاہتا ہے کہ رسول بن کر عام لوگوں سے اس کی قدر و منزلت زیادہ ہو۔ (ل)

2260- ﴿بِمَا كَذَّبُوْنِ﴾ میں با سبب کے لیے ہے یا بدل کے لیے اور آلہ کے لیے لے کر ایک یوں معنی بھی ہو سکتے ہیں، اس چیز کے ساتھ میری مدد کر جس میں انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے۔ یعنی اس عذاب کو بھیج کر جس کا تو نے وعدہ کیا ہے۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾

پس ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی سے کشتی بنا۔ پھر جب ہمارا حکم آئے اور زمین (پر پانی) جوش مارے تو اس میں ہر (ضرورت کی) شے کے نر و مادہ دو دو لے لے۔ اور اپنے اہل کو بھی سوائے اس کے جس کے متعلق ان میں سے پہلے حکم ہو چکا اور ان کے متعلق مجھ سے خطاب نہ کرنا۔ جو ظالم ہیں وہ غرق کیے جائیں گے۔

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَ مَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۸﴾

پس جب تو اور جو تیرے ساتھ ہیں کشتی میں بیٹھ جاؤ، تو کہہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں ظالم قوم سے نجات دی۔ (2261)

وَ قُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۲۹﴾

اور کہہ، اے میرے رب! مجھے برکت والا اتارنا اُتاریو اور تو سب اتارنے والوں سے بہتر ہے۔ (2262)

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّ اِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴿۳۰﴾

یقیناً اس میں نشان ہیں اور ہم آزمائش کرتے رہتے ہیں۔ (2263)

2261- حالانکہ قوم غرق ہوگئی تھی مگر ان کے غرق ہونے پر الحمد نہیں کہا بلکہ اپنی نجات پر، اور نجات بھی ان لوگوں کے ہاتھ سے جنہوں نے ظلم کر کے چند خدا کے بندوں کو ہلاک کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ کسی مصیبت پر خوش نہ ہونا چاہئے۔

2262- مُنْزَل مصدر بھی ہوسکتا ہے بمعنی انزال اور اترنے کی جگہ بھی مراد ہوسکتی ہے۔ یہ دعا اس بنا پر کہ ﴿فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ﴾ کے بعد آتی ہے کشتی میں داخل ہونے کے متعلق سمجھی گئی ہے۔ مگر مجاہد اور ایک جماعت سے روایت ہے کہ یہ وہ دعا ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی سے اترنے کے وقت کرنے کا حکم تھا، اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔

2263- اِنْ بمعنی اِنَّ ہے۔ اور مراد قوم نوح کی آزمائش بھی ہوسکتی ہے۔ مگر نشان کے ذکر کے لحاظ سے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۱﴾

پھر ہم نے ان کے بعد ایک اور نسل پیدا کی۔

فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ ع

پس ان میں انہی میں سے رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں۔ تو کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟(2264)

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَ اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَ يَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور اس کی قوم کے سردار جو کافر تھے، اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے تھے اور ہم نے انہیں دنیا کی زندگی میں آسودگی دی تھی۔ کہنے لگے یہ کچھ نہیں مگر تم جیسا ایک انسان ہے۔ اسی سے کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو، اور اسی سے پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔

وَ لَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور اگر تم اپنے جیسے ایک انسان کی اطاعت کرو گے تو اس حال میں تم یقیناً نقصان اٹھانے والے ہو گے۔

اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَ كُنْتُمْ تُرَابًا وَّ عِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾

کیا وہ تمہیں ڈراتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو تم (پھر) نکالے جاؤ گے؟

هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾

بہت ہی دور (از عقل) بات ہے۔ جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔(2265)

بندوں کی آزمائش مراد لی جائے۔ یہ الفاظ ایک قانون کے رنگ میں ہیں یعنی ہمارا قانون یہ ہے کہ ہم بندوں کی آزمائش کرتے رہتے ہیں۔ یعنی ان کی جودت اور رداءت کو ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

2264- قوم نوح کے بعد جس قوم کا ذکر قرآن شریف نے کیا ہے وہ عاد ہی ہے۔ ﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ﴾ [الأعراف: 69:7] ''اور یاد کرو جب اس نے تم کو نوح کی قوم کے بعد بادشاہ بنایا'' اور ان کے رسول حضرت ہود علیہ السلام تھے۔

2265- ﴿هَيْهَاتَ﴾ ایک کلمہ ہے جو کسی چیز کے دور کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ (غ) اور جو اسم کے ساتھ ہوتا ہے اس پر عرب

اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ﴿۳۷﴾

یہ کچھ نہیں مگر صرف ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ ہم مرتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں، اور ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔ (2266)

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ِۨافْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا وَّ مَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۳۸﴾

وہ کچھ نہیں مگر صرف ایک شخص ہے جس نے اللہ پر جھوٹ افترا کیا ہے، اور ہم اس پر ایمان لانے والے نہیں۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۳۹﴾

(رسول نے) کہا، میرے ربّ! میری مدد کر اس لیے کہ انہوں نے مجھے جھٹلایا۔

قَالَ عَمَّا قَلِیْلٍ لَّیُصْبِحُنَّ نٰدِمِیْنَ ﴿۴۰﴾

فرمایا تھوڑی ہی دیر میں یقیناً پشیمان ہوں گے۔ (2267)

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۱﴾

تو ایک ہولناک آواز نے انہیں حق کے ساتھ آ پکڑا سو ہم نے انہیں کوڑا کرکٹ کر دیا۔ پس ظالم لوگوں کے لیے دوری ہے۔ (2268)

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِیْنَ ﴿۴۲﴾

پھر ان کے بعد ہم نے اور نسلیں پیدا کیں۔

لام داخل کرتے ہیں۔ جیسے یہاں اور نہیں بھی کرتے۔ (ج)

2266- ﴿نَمُوْتُ وَ نَحْیَا﴾ ہم مرتے ہیں اور ہم زندہ ہوتے ہیں۔ یعنی پچھلے مرتے چلے جاتے ہیں نئے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور بعض نے اس سے تناسخ کا عقیدہ نکالا ہے یعنی ان کا منشا یہ ہے کہ جب ہم مرجاتے ہیں تو کسی نئی صورت میں زندہ ہوکر آ جاتے ہیں اور بعثت یا نئی زندگی کوئی شے نہیں۔

2267- ﴿عَمَّا قَلِیْلٍ﴾ کی ترکیب یہ ہے [عَنْ زَمَانٍ قَلِیْلٍ] اور مَا جارو مجرور کے درمیان صلہ ہے جو قلت معنی کی تاکید کے لیے ہے۔

2268- ﴿غُثَآءً﴾ سیلاب اور ہانڈی کا غُثَآءٌ وہ چیز ہے جو ایک چیز بھر کر متفرق ہوجائے۔ جیسے خشک شدہ نبات یا ہانڈی کی جھاگ اور

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾

کوئی قوم نہ اپنے وقت مقرر سے آگے جا سکتی ہے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾

پھر ہم نے اپنے رسول پے در پے بھیجے، جب کبھی کسی قوم کے پاس اس کا رسول آیا انہوں نے اسے جھٹلایا۔ تو ہم بھی ایک کے پیچھے دوسرے کو (ہلاکت میں) پہنچاتے رہے۔ اور ہم نے انہیں کہانیاں بنا دیا۔ پس ان لوگوں کے لیے دوری ہے جو ایمان نہیں لاتے۔ (2269)

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَ اَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۴۵﴾

پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی آیتوں اور کھلی سند کے ساتھ بھیجا۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ۚ﴿۴۶﴾

فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، مگر انہوں نے تکبر کیا اور وہ سرکش لوگ تھے۔

فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۚ﴿۴۷﴾

تو انہوں نے کہا کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لائیں اور ان کی قوم (کے لوگ) ہمارے خدمتگار ہیں۔ (2270)

اس کے ساتھ اس چیز کی مثال دی جاتی ہے جو ضائع ہو جائے اور اس کی کچھ قدر و قیمت نہ سمجھی جائے۔ بُعد کے لیے [دیکھو نمبر: 1477]۔

2269- ﴿تَتْرَا﴾۔ مُوَاتَرَہ سے فَعلَی ہے جس کا مادہ وَتر ہے اور مُوَاتَرَہ کے معنی ہیں وتر، وتر یعنی ایک ایک کر کے ایک کو دوسرے کے پیچھے لانا اور اس کی اصل واؤ ہے جو تا سے بدل گئی ہے۔ (غ)

اَحَادِيْثَ [دیکھو نمبر: 1516]۔ اور یہاں مراد ہے کہ ان کا ذکر صرف خبروں کے طور پر رہ گیا جن کے ساتھ مثال دی جائے۔ (غ)

2270- عٰبِدُوْنَ۔ عَابِد کے معنی خادم مطیع بھی ہیں اور عبادت کرنے والے بھی۔ مگر یہاں خادم ہی مراد ہیں۔ اس لیے کہ دوسری جگہ

فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾

سو انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا، تو ہلاک شدہ (قوموں) میں سے ہو گئے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، تاکہ وہ ہدایت پائیں۔

وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّ اٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾ ع 3 18 3

اور ہم نے ابن مریم اور اس کی ماں کو ایک نشان بنایا ہے اور ان دونوں کو ایک بلند جگہ پر پناہ دی جو ہموار اور چشموں والی تھی۔ (2271)

ہے ﴿وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾﴾ [الشعرآء: 22:26] ''اور یہ وہ نعمت ہے جسے تو مجھ پر جتاتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنالیا ہے۔'' اور عَبَّدَ کے معنی ہیں اسے عبد یا غلام بنالیا۔

2271- رَبْوَةٍ۔ [كُلُّ مَا ارْتَفَعَ مِنَ الْاَرْضِ] یعنی جو زمین بلند ہو اسے رَبْوَةٌ کہا جاتا ہے۔ (ل) اور وہ ایسی بلند زمین ہے جہاں پہاڑ نہ ہو۔ (د) یعنی سطح مرتفع [مَكَانٌ مُرْتَفَعٌ مِنَ الْأَرْضِ عَلٰى مَا حَوْلِهِ]۔ (ج)

قَرَارٍ کے معنی ٹھہرنا ہیں اور ذَاتِ قَرَارٍ کے معنی ہیں ایسی زمین جس میں پانی ٹھہرے۔ (ل) یا سطح مستوی یعنی ہموار جگہ۔ (ج) یا پھلوں والی۔ (ج)

﴿مَعِيْنٍ﴾۔ ﴿بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ﴾ اور [مَآءٍ مَعْيُوْنٍ] کے ایک معنی ہیں ظاہر، یعنی جسے آنکھ زمین پر چلتا دیکھے۔ (ل) کیونکہ عَيْنٌ آنکھ کو کہتے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ اور آپ کی والدہ کا نشان ہونا:

ابن مریم اور اس کی ماں کو ایک نشان بنایا۔ کس لحاظ سے؟ مفسرین اکثر بن باپ پیدائش کی طرف ہی گئے ہیں مگر یہاں ذکر نیک لوگوں کی فلاح اور ان کے ظالموں کے ہاتھ سے نجات پانے کا ہے اور اسی کو بار بار نشان کہا گیا ہے۔ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ﴾ اور قوم نوح کو غرق کرنے کے بعد فرمایا ﴿وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً﴾ [الفرقان: 37:25] ''اور ہم نے انہیں لوگوں کے لیے نشان بنایا۔'' پس قوم نوح اگر ہلاک کیا جانے کے لحاظ سے نشان ہے تو ابن مریم اور ان کی والدہ بچائے جانے کے لحاظ سے نشان ہیں۔ پس مراد ان کا نشان ہونا اسی لحاظ سے ہے کہ انہیں ظالم قوم کے ہاتھ سے نجات دی گئی اور قرآن کریم نے خود اس آیت کا بیان اگلے الفاظ میں کر دیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور اچھے عمل کرو۔

حضرت عیسیٰؑ کو کہاں پناہ ملی:

یہ جگہ کون سی تھی جہاں ابن مریم اور ان کی والدہ کو پناہ ملی؟ مفسرین کا اس میں بہت اختلاف ہے۔ کوئی اسے فلسطین قرار دیتا ہے، کوئی بیت المقدس، کوئی دمشق اور کوئی مصر۔ مگر سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ قرآن شریف کے لفظ ﴿رَبْوَةٍ﴾ ﴿ذَاتِ قَرَارٍ﴾ ﴿ذَاتِ مَعِيْنٍ ان میں سے کسی پر بھی صادق نہیں آتے۔ رَبْوَةٍ چاہتا ہے کہ بلند زمین ہو، ﴿ذَاتِ قَرَارٍ﴾ چاہتا ہے کہ ہموار ہو، پہاڑ نہ ہو یا بہت پھلوں والی ہو، ذَاتِ مَعِيْنٍ چاہتا ہے کہ اس میں سطح زمین پر چشمے اور نہریں بہہ رہی ہوں۔ ان تمام صفات میں اگر کوئی یکتا قطعہ زمین ہے تو وہ کشمیر ہے۔ اور فلسطین اور بیت المقدس اور مصر تو بہر حال نہیں۔ کشمیر کی بلندی چار ہزار فٹ یا اس سے اوپر ہے۔ پھر یہ ﴿ذَاتِ قَرَارٍ﴾ ہموار میدان ہونے کے لحاظ سے بھی ہے اور پھلوں والی جگہ ہونے کے لحاظ سے بھی، پھر چشمے بھی اس میں کثرت سے بہتے ہیں کہ ان کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہاں ایواء یا پناہ دینے کا ذکر ہے اور انبیاء کا جس قدر ذکر قرآن شریف میں ہے وہ بعد تبلیغ ظالم مخالفوں کے ہاتھ سے نجات دینے پر ہی ہے۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو یہ پناہ ملی ہے یہ بھی اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے ملی اور جیسا کہ [نمبر: 762] میں دکھایا گیا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب سے زندہ اتر آئے اور یہاں قرآن کریم نے اس عقدہ کو حل بھی کر دیا کہ صلیب سے زندہ اتر کر پھر کیا ہوا۔ اور یہاں بتا دیا کہ انہیں اور ان کی والدہ کو ایک اور ملک میں پناہ ملی۔ اور اس کا نقشہ ایسا بتا دیا کہ دنیا کے کسی دوسرے حصہ ملک پر وہ صادق نہیں آ سکتا۔ گویا فلسطین سے انہوں نے ہجرت کی۔

یوز آسف نبی کی قبر حضرت عیسیٰؑ کی قبر ہے:

کشمیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنا تاریخ سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ محلہ خانیار شہر سرینگر میں ایک قبر ہے جو یوز آسف کی قبر کے نام سے موسوم ہے اور جسے نبی صاحب کی قبر بھی کہا جاتا ہے۔ اور یہ نہ صرف زبانی روایتوں سے ہی معلوم ہوتا ہے بلکہ تاریخ اعظمی کشمیر جسے لکھے ہوئے ڈیڑھ سو سال گزر چکا ہے اس میں صفحہ 82 پر اس قبر کا ذکر بدیں الفاظ ہے کہ ''یہ قبر عام طور پر ایک نبی کی قبر مشہور ہے اور کہ وہ ایک شہزادہ تھا جو کشمیر میں کسی دوسرے ملک سے آیا اور کہ اس کا نام یوز آسف تھا۔'' اب یہ امر بظاہر غور طلب ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد تو کوئی نبی ہوا نہیں اور نہ کسی ولی کی قبر نبی کی قبر کہلا سکتی تھی۔ اور نبی کا لفظ عربی اور عبرانی زبانوں کا ہے۔ پس لازماً یہ کوئی عبرانی نبی ہیں۔ عرصہ جو روایتاً بیان کیا جاتا ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے ملتا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ نام یوز یا یوس (کیونکہ س۔ ز سے بدل جاتا ہے) اور یسوع باہم ملتے ہیں۔ یہ دلائل ایک زبردست قرینہ ہیں کہ وہ قبر جو محلہ خانیار میں ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر ہی ہے اور کسی نبی کی قبر نہیں۔

افغانوں اور کشمیریوں کا بنی اسرائیل سے ہونا:

علاوہ ازیں اور بھی وجوہات ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مشرق کی طرف آئے۔ افغانستان اب تک اپنے آپ کو بنی اسرائیل بتاتے

صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ﴿۵۱﴾

میں اسے جو تم کرتے ہو جانتا ہوں۔ (2272)

وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾

اور کہ یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، سو میرا تقویٰ کرو۔

فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾

پھر انہوں نے اپنے دین کو آپس میں قطع کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ سب گروہ اس پر جو اُن کے پاس ہے خوش ہیں۔ (2273)

ہیں اور ان کی روایات اور رسم و رواج سے، ان کے نقشوں سے ان کا بنی اسرائیل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یہی بات اہل کشمیر کے متعلق معلوم ہوتی ہے اور کشمیر کے بہت سے شہروں کے نام فلسطین کے شہروں پر ہیں۔ جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کچھ حصہ بنی اسرائیل کا ایام جلاوطنی میں افغانستان اور کشمیر میں آ آباد ہوا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب یہود فلسطین کی ایذا دہی سے ہجرت کرنی پڑی تو آپ نے ان اقوام بنی اسرائیل کی طرف رخ کیا جو اپنے وطن سے الگ ہو چکی تھیں۔ اور حدیث میں جو آتا ہے [اَنَّ عِیْسٰی عَاشَ عِشْرِیْنَ وَمِائَةَ سَنَةً] (کنزالعمال، جلد13، صفحہ676، حدیث: 37735) یعنی حضرت عیسیٰ ایک سو بیس سال زندہ رہے، اس کی رو سے بھی ضروری ٹھہرتا ہے کہ بقیہ عمر آپ نے کہیں اور گزاری ہو۔

2272- یہ خطاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہے، اور ایک شخص کے لیے بعض وقت جمع کا صیغہ استعمال ہو جاتا ہے۔ (ج) اور مراد یہ ہے کہ ہم نے جب عیسیٰ اور ان کی والدہ کو اچھی جگہ پر پناہ دی تو ساتھ ہی ان کو یہ بھی کہہ دیا کہ طیبات سے کھاؤ۔ (د) جس سے معلوم ہوا کہ وہ خطہ زمین پھلوں والا بھی تھا۔ جیسا کہ ﴿ذَاتِ قَرَارٍ﴾ کے معنی میں بیان ہوا ہے۔ اور یا یہ حکایت کے طور پر ہے کہ ہر رسول سے اس کے زمانہ میں یوں ہی خطاب ہوا تھا اور اب گویا نبی کریم ﷺ کو انہی الفاظ میں خطاب ہوتا ہے۔ اور امام راغب کہتے ہیں کہ رُسُل کے لفظ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ آپ کے برگزیدہ اصحاب شامل ہیں۔

2273- **مذاہب مختلفہ کا باہمی فساد اور کل دنیا کی طرف ایک رسول کا آنا:** مختلف رسولوں کا ذکر کرنے سے منشا یہ ہے کہ سب خدا کی طرف سے آئے اور اصلاح خلق ان کے مدنظر تھی۔ سب کے حالات ان کا دشمنوں کے ہاتھ سے نجات پانا اور اللہ تعالیٰ کی توحید کو دنیا میں قائم کرنا یکساں تھا۔ اسی لیے پہلے ﴿یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ﴾ میں سب کو ایک ہی لفظ سے خطاب کیا، پھر ان کی بعثت کا مقصد، ایک ہونے کا ذکر اور بھی صراحت سے ان الفاظ میں کیا ﴿اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ یعنی رسولوں کی جماعت ایک ہی جماعت ہے اور ان کی بعثت کی غرض دنیا میں اس بات کا قائم کرنا ہے کہ سب کا رب اللہ ہے، اس کا تقویٰ اختیار کیا جائے۔ لیکن ان کے پیروؤں نے اس واحد مقصد کو ملیا میٹ کر دیا اور امر دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ہر گروہ صرف جو

فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۵۴﴾

سو انہیں اپنی جہالت میں ایک وقت تک پڑا رہنے دے۔

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿۵۵﴾

کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ جو ہم ان کو مال اور بیٹوں سے مدد دے رہے ہیں۔

نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

تو ہم ان کو بھلائی پہنچانے میں جلدی کر رہے ہیں۔ بلکہ وہ محسوس نہیں کرتے۔ (2274)

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾

جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔ (2275)

اس کے اپنے پاس تھا اس پر خوش ہو گیا۔ اور دوسرے رسولوں کی رسالت کا انکار کر دیا اور نسل انسانی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ یہ اس آیت کا مضمون ہے اور اس کے بیان کرنے کی غرض صاف ہے کہ اس حالت میں ضروری تھا کہ سب کو ایک دین پر جمع کرنے کے لیے اور اس حقیقت کو دنیا میں آشکارا کرنے کے لیے کہ سب مذاہب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، ایک رسول مبعوث ہوتا۔ جیسا کہ آگے چل کر ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ﴾ [الفرقان: 1:25] ''وہ (ذات) بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا تاکہ وہ تمام جہان کے لیے ڈرانے والا ہو۔'' میں بیان فرمایا۔

2274- **دنیا کا مال اور جتھہ کامیابی نہیں:** یہاں بتایا ہے کہ لوگ دنیا کے مال اور جتھے کو یعنی دنیوی طاقت کو ہی کامیابی سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ فلاح سے اتنے دور پڑے ہوئے ہیں کہ ان کو یہ احساس بھی نہیں کہ فلاح کسے کہتے ہیں، اور حقیقی کامیابی بلند اخلاق سے ہے نہ مال و دولت سے۔ اسی کو غَمْرَةٍ یعنی ان کی جہالت کہا ہے جس میں وہ ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور اسی لیے اس کے بالمقابل اگلی آیات میں پھر اللہ تعالیٰ سے تعلق کا ذکر کیا ہے، جو اخلاق فاضلہ کی بنیاد ہے۔

2275- ﴿مُّشْفِقُوْنَ﴾۔ شَفَق دن کی روشنی کا رات کی سیاہی سے مل جانا ہے۔ جو غروب آفتاب کے وقت ہوتا ہے ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ﴾ [الانشقاق: 16:84] ''سو نہیں میں شام کی سرخی کی قسم کھاتا ہوں۔'' اور اِشفاق فکر ہے جو خوف کے ساتھ ملا ہوا ہو۔ ﴿وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ۝﴾ [الأنبیآء: 49:21] ''اور (اس) گھڑی کا ان کو خوف ہے۔'' اور جب اس کا صلہ مِن ہو تو خوف کے معنی اس میں غالب ہوتے ہیں اور فِی صلہ ہو تو فکر کے معنی غالب ہوتے ہیں ﴿اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝﴾ [الطور: 26:52] ''ہم پہلے اپنے اہل میں ڈرنے والے تھے۔'' ﴿مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا﴾ [الشوریٰ: 22:42] ''اس سے ڈر رہے جو انہوں نے کمایا۔'' ﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا﴾ [المجادلة: 13:58] ''کیا تم ڈر گئے کہ پہلے دیا کرو'' (غ) اور شَفَقَةٌ اسی

وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۵۸﴾

اور وہ جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا یُشْرِكُوْنَ ۙ﴿۵۹﴾

اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ (کسی کو) شریک نہیں کرتے۔

وَ الَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۙ﴿۶۰﴾

اور وہ جو دیتے ہیں جو کچھ کہ وہ دیتے ہیں، حالانکہ ان کے دل خوف سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ (2276)

اُولٰٓىٕكَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾

یہ لوگ نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں اور وہ ان کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں۔ (2277)

وَ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَ لَدَیْنَا كِتٰبٌ یَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور ہم کسی شخص پر کچھ بوجھ نہیں ڈالتے مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اور ہمارے پاس کتاب ہے جو سچ سچ بتا دیتی ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (2278)

سے اسم ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں [اَشفَقْتُ عَلَیْهِ وَ اَنَا مُشْفِقٌ وَ شَفِیْقٌ] (ل)

2276- ﴿یُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا﴾۔ اِیْتَآءٌ کے معنی اعطاء یا دینا ہیں اور صدقات کے دینے پر بالخصوص بولا گیا ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اور ان کا خوف اس لیے ہوتا ہے کہ ان کا دینا اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہوگا یا نہیں۔ یا اس لیے کہ کافی طور پر اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہے یا نہیں۔ اور ان آیات میں دو ہی باتوں کا ذکر کیا۔ ایک اللہ تعالیٰ کا خوف اور عظمت دل میں ہونا اور اس کی توحید پر قائم ہونا اور دوسرے اپنے مال کو مخلوق خدا کی خدمت میں لگا دینا۔

2277- اوپر کہا تھا کہ مال اور جتھہ خَیْرٰتِ نہیں۔ یعنی ایسی بھلائیاں جو انسان کی فلاح کا موجب ہو جاتی ہیں۔ تو اب اللہ تعالیٰ سے تعلق اور مخلوق خدا کی خدمت کا ذکر کر کے بتایا کہ خَیْرٰتِ یہ ہیں، یعنی انسان کی فلاح کا تعلق ان چیزوں سے ہے اور جو لوگ بجائے دنیا کے مال پر جھکنے کے ان کے لینے کے لیے جلدی کرتے ہیں وہ ان خَیْرٰتِ کی وجہ سے سابق بن جاتے ہیں یعنی دوسرے لوگوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔

2278- مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام انسان کی فلاح کے لیے دیئے ہیں یا جو راہیں ترقی کی اسے بتائی ہیں تو یہ کوئی ایسے امور نہیں جو عام انسانوں کی وسعت سے باہر ہوں۔ اور ﴿كِتٰبٌ یَّنْطِقُ بِالْحَقِّ﴾ میں اپنا قانون بیان فرمایا کہ اعمال کے نتائج

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَ لَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾

بلکہ ان کے دل اس سے غفلت میں ہیں، اور اس کے سوائے ان کے اور عمل بھی ہیں جو وہ کرتے رہتے ہیں۔ (2279)

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿۶۴﴾

یہاں تک کہ جب ہم ان کے آسودہ حال لوگوں کو عذاب میں پکڑیں گے تو اس وقت وہ چلانے لگیں گے۔ (2280)

لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ ۫ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾

آج مت چلاؤ، تمہیں ہماری طرف سے کوئی مدد نہیں دی جائے گی۔

قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۶﴾

میری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم اپنی ایڑیوں پر الٹے پھر جاتے تھے۔ (2281)

پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ جو کچھ انسان کرتا ہے اسی کے مطابق نتیجہ پاتا چلا جاتا ہے۔

2279- ان کے دل جہالت میں ہیں یعنی اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ترقی کی راہیں انسان کے اخلاق میں مضمر ہیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ پھر طرح طرح کی بدعملیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جن کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

2280- **اہل مکہ پر عذاب قحط:** گو ان الفاظ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ جب انہیں عذاب میں پکڑیں گے تو وہ چلائیں گے۔ لیکن آیت 75 سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی کوئی عذاب ان پر آیا تھا۔ اور چونکہ یہ سورت مکی ہے اس لیے غالباً یہ عذاب قحط تھا جس کے لیے نبی کریم ﷺ نے دعا بھی کی تھی اور جس کا ذکر قرآن کریم میں پیشگوئی کے طور پر سورۃ الدخان میں آتا ہے [10-12]۔ اور احادیث میں ہے کہ یہ قحط اس قدر شدید ہوا کہ انہوں نے مردار اور چمڑے اور ہڈیاں کھائیں۔ اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبل از ہجرت تھا اور بعض سے یہ کہ یہ بعد از ہجرت تھا۔ اور چونکہ یہ سات سال کا قحط تھا اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ ہجرت سے قبل شروع ہو کر بعد تک رہا۔

2281- ﴿تَنْكِصُوْنَ﴾۔ نَکَص کے معنی ہیں ایک امر سے پھر گیا یا بھلائی کی جس حالت پر تھا اس سے لوٹ گیا اور یہ خصوصیت سے بھلائی سے لوٹ جانے پر بولا جاتا ہے۔ (ل)

مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾

اکڑتے ہوئے، اسے مشغلہ بناتے ہوئے بکواس کرتے تھے۔ (2282)

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾

تو کیا انہوں نے (اس) بات پر غور نہیں کیا بلکہ ان کے پاس وہ بات آئی ہے جو ان کے پہلے باپ دادوں کے پاس نہ آئی تھی۔ (2283)

2282- ﴿سٰمِرًا﴾۔ سُمْرَةٌ گندم گوں رنگ کو کہتے ہیں۔ اور سَمَر رات کی سیاہی کو اور رات کے وقت باتیں کرنے کو بھی کہا جاتا ہے۔ اور یہاں سامر جمع کے مقام پر استعمال ہوا ہے۔ (غ)

﴿تَهْجُرُوْنَ﴾۔ هَجَرَ کے اصل معنی دوسرے سے الگ ہو جانا ہیں اور هُجْرٌ وہ کلام ہے جس کی برائی کی وجہ سے اسے ترک کر دیا گیا ہو۔ اس لیے اَهْجَرَ کے معنی ہیں قصداً ایسا کلام کیا اور [هَجَرَ الْمَرِيْضُ] کے معنی ہیں بلا قصد ایسا کلام کیا۔ (غ)

﴿مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ﴾ میں جمہور مفسرین نے مراد لیا ہے خانہ کعبہ کی وجہ سے متکبر بنے ہوئے تھے۔ مگر ضمیر کا قرآن شریف کی طرف پھیرنا جس کا ذکر اٰيٰتِيْ میں ہے اولیٰ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کو سن کر متکبرانہ روش سے چھوڑ جاتے تھے اور سٰمِرًا میں ان کا خانہ کعبہ میں بیٹھ کر رات کے وقت قرآن شریف کے متعلق طرح طرح کی باتیں بنانا ہے۔ گویا قرآن شریف کا ذکر ایک مشغلہ کے طور پر کرتے تھے۔

2283- اَمْ استعمال کئی وجہ پر ہے۔ کبھی وہ متصل ہوتا ہے اور اس سے پہلے ہمزۂ تسویہ آتا ہے جیسے ﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ﴾ [المنافقون: 6:63] ''ان پر برابر ہے کہ تو ان کے لیے بخشش مانگے یا ان کے لیے بخشش نہ مانگے۔'' ﴿سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا﴾ [إبراهيم: 21:14] ''ہمارے لیے برابر ہے کہ ہم واویلا کریں یا صبر کریں۔'' اور یا اس سے پہلے ہمزہ طلب آتا ہے جیسے ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۭ﴾ [النازعات: 27:79] ''کیا پیدائش میں تم زیادہ سخت ہو یا آسمان!'' اور دوسرا یہ کہ وہ منقطعہ ہوتا ہے اور اس صورت میں یا اس سے پہلے محض ایک خبر ہوتی ہے ﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ﴾ [السجدة: 32:2-3] ''اس کتاب کا اتارنا اس میں کچھ شک نہیں جہانوں کے رب کی طرف سے ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں اس نے خود اسے بنا لیا ہے۔'' یا اس سے پہلے ہمزہ ہوتا ہے جو استفہام کے لیے نہ ہو۔ جیسے ﴿اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ﴾ [الأعراف: 195:7] ''کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں۔'' جہاں ہمزہ انکار کے لیے ہے یا اس سے پہلے استفہام بغیر ہمزہ ہوتا ہے جیسے ﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ﴾ [الرعد: 16:13] ''کہہ کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہیں؟ یا کیا اندھیرا اور روشنی برابر ہیں؟ یا کیا انہوں نے اللہ کے کوئی ایسے شریک بنائے ہیں۔'' جہاں مراد ان کے شرک کی خبر

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۶۹﴾

کیاانہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا؟ اس لیے وہ اس سے منکر ہیں۔ (2284)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۰﴾

کیا کہتے ہیں اسے جنون ہے۔ بلکہ وہ ان کے پاس حق لایا ہے، اوران میں سے اکثر حق کو ناپسند کرتے ہیں۔ (2285)

وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾

اوراگر حق ان کی خواہش کے مطابق ہوتا تو آسمان اور زمین اور جو کوئی ان کے اندر ہیں بگڑ جاتے۔ بلکہ ہم ان کے پاس ان کی بڑائی (کا سامان) لائے ہیں۔ سو وہ اپنی بڑائی سے منہ پھیرنے والے ہیں۔ (2286)

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۚ وَّ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۷۲﴾

کیا تو ان سے کچھ صلہ مانگتا ہے، تو تیرے رب کا صلہ بہتر ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔

وَ اِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۳﴾

اور یقیناً تو انہیں سیدھے رستہ کی طرف بلاتا ہے۔

دینا ہے۔ اس صورت میں یہ بمعنی بَلْ یعنی بلکہ ہوتا ہے۔ (مغنی) اور یہاں اَمْ بمعنی بَلْ ہے اور مراد ذکر یا قرآن کا آنا ہے اور یا مراد آرام اور آسائش ہے کہ ان کو اتنی آسودگی ملی ہے جو ان کے باپ دادوں کو نہیں ملی تھی۔ اس لیے قرآن پر غور نہیں کرتے۔

2284- مطلب یہ ہے کہ رسول کو تو پہچانتے ہیں اس کے کوئی حالات ان سے مخفی نہیں۔ وہ آپ کی نیکی کے اس حد تک معترف تھے کہ آپ کو الامین کے نام سے پکارتے تھے۔ پس ایسے راستباز انسان کا جسے بچپن سے جانتے تھے انکار جائے تعجب تھا۔

2285- یعنی رسول کو تو پہچانتے ہیں کہ وہ صادق اور امین ہے مگر وہ حق جو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لایا ہے وہ پسند نہیں۔

2286- آسمان وزمین کا نظام تو پابندیٔ قانون پر ہے۔ مگر وہ اپنی خواہشات کی پیروی میں کسی قانون کا پابند ہونا نہیں چاہتے۔ اگر حق بھی ایسا ہی ہوتا تو نظام عالم قائم نہ رہتا۔ اس قانون کی اتباع میں ان کے لیے عزوشرف ہے جس سے وہ منہ پھیر رہے ہیں۔

وَ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿۷۴﴾

اور وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے، رستہ سے ہٹ رہے ہیں۔ (2287)

وَ لَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَ كَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۵﴾

اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور جو انہیں تکلیف ہے اسے دور کریں تو وہ اپنی سرکشی میں حیران پھرتے ہوئے اصرار کریں۔ (2288)

وَ لَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَ مَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۷۶﴾

اور ہم نے انہیں عذاب میں پکڑا، مگر وہ اپنے رب کے آگے نہ گرے اور یہ عاجزی کرتے ہی نہیں۔ (2289)

حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۷﴾ ع 4 27 4

یہاں تک کہ جب ہم ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے پھر ناگہاں وہ اس میں مایوس ہو جائیں گے۔

وَ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، بہت ہی کم تم شکر کرتے ہو۔

2287- نٰكِبُوْنَ۔ [نَكَبَ عَنْ كَذَا] کے معنی ہیں اس چیز سے دوسری طرف مائل ہو گیا۔

2288- لَجُّوْا۔ لَجاج سرکشی اور عناد کو کہتے ہیں، جو ایسے فعل کے کرنے میں دکھائے جائیں جس سے روکا گیا ہو۔ اور [لُجَّةَ الْبَحْر] اس کی امواج کا پھر پھر کر آنا ہے۔ اسی سے ہے ﴿بَحْرٍ لُّجِّيٍّ﴾ [النور: 40:24] ''گہرے سمندر۔'' (غ) ﴿حَسِبَتْهُ لُجَّةً﴾ [النمل: 44:27] ''اسے بہت گہرا پانی سمجھا۔''

2289- اِسْتَكَانَةٌ اور تضرع دونوں اظہار عاجزی کے لیے ہیں۔ مگر اِسْتَكَانَةٌ میں اظہار عاجزی فرمانبرداری کے اختیار کرنے سے ہے۔ [دیکھو نمبر: 532] اور تضرع میں اس کا تعلق دل سے ہے۔ اسی لیے دعا میں تضرع ہوتا ہے [دیکھو نمبر: 957]۔ یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ عذاب کی اصل غرض صرف انسانوں کو خدا کی طرف جھکانا ہے اور اگلی آیت میں بتایا کہ سخت عذاب آنے پر رحمت الٰہی سے بھی مایوس ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ رحم کرنے کے لیے تیار ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ ذَرَاَكُمْ فِی الْاَرْضِ وَ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۹﴾

اور وہی ہے جو تمہیں زمین کے اندر وجود میں لاتا ہے اور اسی کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے۔ (2290)

وَ هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ وَ لَهُ اخْتِلَافُ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۸۰﴾

اور وہی ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے اور رات اور دن کا اختلاف اسی (کے اختیار) کا ہے۔ تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾

بلکہ اسی کی طرح کہتے ہیں جو پہلوں نے کہا۔

قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾

کہتے ہیں کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے، کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟

لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۸۳﴾

ہمیں اور ہمارے باپ دادوں کو پہلے سے یہی وعدہ دیا جاتا رہا ہے۔ یہ کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں ہیں۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِیْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾

کہہ، زمین اور جو اس میں ہے وہ کس کے لیے ہیں؟ اگر تم جانتے ہو۔

سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾

کہیں گے اللہ کے لیے۔ کہہ، تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ﴿۸۶﴾

کہہ، ساتوں آسمانوں کا رب اور بڑے عرش کا رب کون ہے؟

2290- ﴿ذَرَاَ﴾۔ ذَرْأ۔ اللہ تعالیٰ کا اس کو ظاہر کرنا ہے جس کی اس نے ابتدا کی اور [ذَرَأَ اللّٰهُ الْخَلْقَ] کے معنی ہیں مخلوق کے اشخاص کو وجود میں لایا۔ (غ) اور ﴿یَذْرَؤُكُمْ فِیْهِ﴾ [الشوریٰ: 11:42] ''وہ اس (طرح) تمہیں پھیلاتا رہتا ہے۔'' میں معنی [یَكْثُرُكُمْ فِیْهِ] کیے گئے۔

سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۶﴾

کہیں گے اللہ کے لیے ہی ہے۔ کہہ تو کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾

کہہ، کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے؟ اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابل پناہ نہیں ملتی۔ اگر تم جانتے ہو۔

سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾

کہیں گے اللہ کے لیے ہی ہے۔ کہہ پھر تمہیں کہاں سے دھوکا لگتا ہے۔

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۰﴾

بلکہ ہم ان کے پاس حق لائے ہیں اور وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ (2291)

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾ۙ

اللہ نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا معبود ہے۔ اس صورت میں ہر ایک معبود اسے لے جاتا جو اس نے پیدا کیا ہوتا اور ان میں سے ایک دوسرے پر بڑائی حاصل کرنے میں لگا رہتا۔ اللہ اس سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔ (2292)

2291- یہ حق توحید ہے۔ اوپر کی آیات میں تین باتوں کا اثبات کیا ہے۔ [آیت نمبر: 84-85] میں خلق کا اثبات صرف اللہ کے لیے ہے اور [آیت نمبر: 86-87] میں ربوبیت کا اور آیت [آیت نمبر: 88-89] میں حکومت کا اور ان باتوں کا اقرار کفار کے منہ سے کرایا ہے۔ کیونکہ ان باتوں کا اقرار مشرکوں کو بھی ہے کہ خلق اور ربوبیت اور حکومت اللہ تعالیٰ کا ہی کام ہے نہ مسیح کا، نہ بتوں کا۔ اور آخر پر فرمایا کہ دوسرے معبود بنانے میں خواہ وہ مسیح کی طرح خدا کا بیٹا کہلائے یا کوئی بت وغیرہ ہو مشرک جھوٹے ہیں۔

2292- **شرک کے خلاف ایک دلیل:** جب دو بادشاہ ایک ملک میں نہیں ہو سکتے تو اتنی بڑی مخلوق کا انتظام کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ اگر خدا کے ساتھ کوئی اور بھی شریک ہو۔ کیسی سیدھی اور قطعی دلیل ہے۔

عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾

غیب اور حاضر کا جاننے والا، سو وہ اس سے بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾

کہہ، میرے رب اگر تو مجھے وہ دکھائے جس کا انہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔

رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾

میرے رب! تو مجھے ظالم لوگوں میں نہ رکھیو۔ (2293)

وَ اِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾

اور ہم اس پر کہ تجھے وہ دکھائیں جس کا انہیں وعدہ دیتے ہیں قادر ہیں۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾

بدی کو اس (بات) کے ساتھ دور کر جو بہت اچھی ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں جو وہ بیان کرتے ہیں۔ (2294)

2293- **مخالفین کا استیصال آپ کی زندگی میں:** اس دعا کا منشا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نزول عذاب اس حالت میں نہ ہو کہ آپ ان ظالم لوگوں کے اندر ہوں۔ کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور ﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾ [الأنفال: 25:8] ''اور اس عظیم الشان فتنہ سے بچاؤ کرلو جو خاص کر ان لوگوں کو نہ پہنچے گا (مگر ان کو) جو تم میں سے ظالم ہیں۔'' کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے۔ اگلی آیت میں بتادیا کہ ان لوگوں کی قوت کا استیصال جنہوں نے حق کا استیصال کرنا چاہا آپ کی زندگی میں ہوجائے گا۔

2294- **بدی کے مقابل پر نیکی کی تعلیم احسن پیرایہ میں:** جو تمہارے ساتھ بدی کرتا ہے تم اس کے ساتھ نیکی کرو۔ یہ تمام راستبازوں کی تعلیم ہے۔ اور حضرت مسیح کے ساتھ اسے کوئی خصوصیت حاصل نہیں۔ کیونکہ یہ تعلیم باوجود ایک بلند پایہ تعلیم ہونے کے ہر حالت میں عمل میں نہیں آسکتی۔ قرآن کریم چونکہ ایک کامل کتاب تھی اس لیے اس بلند پایہ تعلیم میں جو نقص تھا اسے دور کرکے پیش کیا ہے۔ اور اس نقص کو دور کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا لفظ اِدْفَعْ اختیار فرمایا ہے یعنی بدی کو دفع کرنا اصل غرض ہو۔ اگر ایک بدی بالمقابل نیکی کرنے سے دور نہیں ہوسکتی تو اس وقت نیکی کرنے کا حکم قرآن شریف نے نہیں دیا بلکہ پھر ﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ بھی ہے۔ بہرحال مقدم امر بدی کا دفع کرنا ہے اور اس کے دفع کرنے میں بہترین طریق اختیار کرنے کا حکم ہے اور یہ بہترین طریق بعض وقت بالمقابل نیکی کا اختیار کرنا ہے، بعض وقت صرف بدی سے درگزر کرنا،

وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾

اور کہہ میرے ربّ! میں شیطانوں کی عیب جوئی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ (2295)

وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾

اور میرے ربّ میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے سامنے آئیں۔

بعض وقت اس پر ملامت کرنا، بعض وقت اس کی سزا دینا۔

2295- ﴿هَمَزٰتِ﴾۔ هَمْزَةٌ کی جمع ہے۔ هَمَزَ کے معنی غَمَزَ ہیں یعنی اشارہ کیا اور جانور کو چلنے کا اشارہ کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ اسی سے مِهماز ہے جس سے جانور کو چلایا جاتا ہے۔ اور هَمْز کے معنی عیب ہیں اور هُمَزَةٌ اور هَمّاز عیب لگانے والے کو کہا جاتا ہے۔ جو پیٹھ پیچھے عیب لگائے اور لُمَزَةٌ وہ ہے جو سامنے عیب لگائے اور ﴿هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ﴾ شیطان کے وساوس یا خطرات کو کہا جاتا ہے اور حدیث میں دعائے افتتاح صلوٰۃ آتی ہے [اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ، مِنْ هَمْزِهِ، وَنَفْثِهِ، وَنَفْخِهِ.] (مسند أحمد، جلد8، صفحہ434، حدیث: 3907) تو دریافت کیا گیا کہ یارسول اللہ! اس کا هَمْز اور نَفْث اور نَفْخ کیا ہے؟ تو فرمایا اس کا هَمْز جنون ہے اور اس کا نَفْث شعر ہے اور اس کا نَفْخ کبر ہے۔ (ل) اور هَمْز کے معنی عَصْر یا دبانا بھی ہیں۔ اور انسان کا هَمْز اس کی پیٹھ پیچھے اس کے عیب بیان کرنا ہے۔ (غ)

يَّحْضُرُوْنِ۔ حَضَر اصل میں بدو کے خلاف ہے، یعنی جنگل یا گاؤں کے رہنے کے۔ پھر کسی مکان میں جانے یا کسی انسان کے پاس جانے یا اور کسی قسم کی موجودگی پر یہ لفظ بولا گیا ہے۔ اور مُحضَر وہ چیز ہے جو سامنے لائی جائے ﴿مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا﴾ [آل عمران: 30:3] ''جو کچھ اس نے نیکی کی ہے موجود پائے گا۔'' ﴿جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ﴾ [يٰسٓ: 32:36] ''سب کے سب ہی ہمارے حضور حاضر کیے جائیں گے۔'' (غ)

آنحضرت ﷺ کا شیطانی وساوس سے محفوظ ہونا:

عام طور پر یہاں ﴿هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ﴾ سے مراد وساوس شیطانی لیے گئے ہیں اور آنحضرت ﷺ کو یہ حکم ہونا کہ وساوس شیطانی سے اللہ کی پناہ مانگو، بتاتا ہے کہ آپ وساوس شیطانی سے محفوظ تھے کیونکہ جو اللہ کی پناہ میں آتا ہے وہ شیطان سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میرا شیطان میرا فرمانبردار ہو گیا ہے اور وہ سوائے بھلائے کے مجھے کسی چیز کا حکم نہیں کرتا۔ اور قرآن کریم میں کہیں ذکر نہیں کہ کبھی شیطان نے کوئی وسوسہ آنحضرت ﷺ کے دل میں ڈالا۔ ہاں انجیل میں یہ ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شیطان نے بعض باتیں کہیں تھیں، جس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ وساوس آپ کے دل میں ڈالے تھے۔ چنانچہ اس کا ذکر [متی: 14:1-10] میں ہے۔ گو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان وساوس کو رد کر دیا اور انہیں قبول نہیں کیا۔ مگر آنحضرت ﷺ کا مقام بہت بلند ہے۔ لیکن اگر سیاق پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾

تو جب ان میں سے ایک کو موت آتی ہے کہتا ہے میرے رب مجھے لوٹاؤ۔ (2296)

لَعَلِّيْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَ مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

تاکہ میں اس میں جسے چھوڑ آیا ہوں اچھا عمل کروں۔ ہرگز نہیں۔ وہ ایک بات ہے جسے وہ کہے گا اور ان کے سامنے ایک روک ہے اس دن تک کہ وہ اٹھائے جائیں۔ (2297)

شیاطین سے مراد رؤسائے کفار ہیں اور ان کے ہمزات سے مراد ان کی عیب جوئی اور بدگوئی جو وہ رسول اللہ ﷺ کی کرتے تھے۔ چنانچہ اوپر کی آیت ﴿نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ﴾ میں صاف ان کی ان بدگوئیوں کا ذکر ہے اور انہی کے مقابل پر ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ بھی فرمایا تھا۔ اور بعد کی آیت میں صاف طور پر فرمایا ﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ﴾ یعنی انہی شیطانوں میں سے ایک کو موت آتی ہے تو وہ یوں کہتا ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اوپر ذکر رؤسائے کفر کا تھا۔ اور جنہوں نے وساوس شیطانی مراد لیے ہیں، وہ کوئی تعلق اس مضمون کا نہ اگلے مضمون سے بتا سکتے ہیں نہ پچھلے سے۔

2296- **جمع کے خطاب سے مراد تکرار فعل بھی ہوتا ہے:** اِرْجِعُوْنِ اصل میں ارجعونی ہے اور ارجعوا جمع کا صیغہ ہے جو بعض کے نزدیک بلحاظ تعظیم کے لیے۔ بعض کے نزدیک خطاب ملائکہ کو ہے اور اصل یہ ہے کہ تثنیہ یا جمع کی ضمیر بعض وقت تکرار کے لیے آ جاتی ہے۔ جیسا دوسری جگہ آتا ہے ﴿اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ﴾، جہاں مطلب ہے اَلْقِ اَلْقِ اور یہاں مراد ہے [اِرْجِعْنِيَ اِرْجِعْنِيَ]۔

2297- ﴿كَلَّا﴾ بعض کے نزدیک كٗ تشبیہ اور لا نافیہ سے مرکب ہے اور بعض کے نزدیک بسیط ہے وہ کلمہ زجر ہے یعنی ایک چیز سے روکنے کے لیے آتا ہے۔ (مغنی)

﴿بَرْزَخٌ﴾ دو چیزوں کے درمیان روک اور حد کو کہتے ہیں ﴿بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۚ﴾ [الرحمٰن: 20:55] ''ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہے جس سے آگے نہیں گزر سکتے۔'' اور برزخ وہ حالت ہے جو انسان کی موت سے لے کر قیامت تک ہے۔ (غ)

﴿فِيْمَا تَرَكْتُ﴾ میں اشارہ ایمان کی طرف ہے جسے پہلے چھوڑ دیا اور یہ خواہش کفار سے خاص نہیں بلکہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں زکوٰۃ اور حج کو چھوڑنے والے بھی یہی خواہش کریں گے اور حدیث میں ہے کہ ہر چیز جو انسان کو قبول حق میں مانع ہوتی ہے۔ موت کے وقت اس کے سامنے آ جاتی ہے اور وہ خواہش کرتا ہے کہ اسے واپس بھیجا جائے۔ ﴿مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴾ میں بتا دیا کہ موت کے بعد حالت برزخ ہے اور انسان کی دوبارہ زندگی پھر ﴿يَوْمِ الْبَعْثِ﴾ میں ہی ہوگی اور اس

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

سو جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن ان میں رشتہ داریاں نہ رہیں گی اور نہ ایک دوسرے سے (حال) دریافت کریں گے۔ (2298)

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

پس جس کے اچھے عمل بھاری ہوں گے تو وہی کامیاب ہوں گے۔

سے پیشتر وہ کبھی زندگی کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔

عالم برزخ:

قرآن کریم اور احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد عذاب اور ثواب کا ایک رنگ شروع ہو جاتا ہے گو اس کا کامل ظہور قیامت کے دن ہی ہوگا۔ مثلاً لوگ جو نیکی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات پر پہنچ گئے ہیں۔ جیسے شہداء ان کو رزق کا ملنا یا مومن کی قبر میں جنت کی کھڑکی کا کھولا جانا جس کا ذکر احادیث میں ہے ایسا ہی فرعون صفت لوگوں کا عذاب میں مبتلا ہونا معلوم ہوتا ہے۔ البتہ یہ حالت کامل انکشاف کی نہیں اور انسان کی زندگی کی اس حالت کے مشابہ ہے جو ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے جس پر ایک پردہ اخفا کا رہتا ہے۔ اور حالت برزخ میں بعض لوگوں کا عرصہ دراز اور بعض کا کم عرصہ رہنا قابل اعتراض نہیں۔ اس لیے کہ وقت کا احساس وہاں نہیں ہوگا۔ اور یہ باتیں کہ روحیں عالم برزخ سے اس دنیا میں آتی رہتی ہیں اور وہ اپنے مکانوں وغیرہ میں جاتی ہیں محض قصے ہیں۔ ہاں رؤیا یا کشف میں ان کی ملاقات ایک علیحدہ رنگ رکھتی ہے۔

2298- ﴿اَنْسَابَ﴾۔ نَسب کی جمع ہے۔ اور نَسَبٌ اور نِسْبَةٌ اشتراک ہے جو ماں یا باپ کی طرف سے ہو اور نِسْبَةٌ کا استعمال دو مقداروں میں ہوتا ہے جن میں کسی قسم کا تجانس ہو۔ (غ)

﴿فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ﴾ سے مراد ہے کہ کوئی نسب فائدہ نہ دے گی یعنی صرف اعمال ہی فائدہ دیں گے اور یہ جو حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن ہر سبب اور نسب منقطع ہوگا سوائے میرے سبب اور نسب کے۔ تو اس سے یہ مراد نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے نسب سے ہونا نجات کے لیے کافی ہے۔ اور اگر کوئی سید عیسائی ہو جائے تو بھی وہ نجات یافتہ ہوگا اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر فاطمہ بنت محمدؐ چوری کرے تو اس کے ہاتھ بھی کاٹے جائیں۔ پس جب نسب اس دنیا کی سزا سے نہیں بچا سکتی تو قیامت کی سزا سے کس طرح بچا سکتی ہے بلکہ یہاں نسب اپنے وسیع معنی میں ہے۔ یعنی آنحضرت ﷺ کے ساتھ تعلق روحانی مراد ہے اور ایک دوسرے سے دریافت نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ حال دریافت نہیں کریں گے۔ ﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَىِٕذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾﴾ [عبس: 37:80] ''ہر انسان کے لیے اس دن ایک کام ہوگا جو اسے کافی ہوگا۔''

وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اور جس کے اچھے عمل ہلکے ہوں گے پس وہی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں رکھا، جہنم میں رہیں گے۔

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَ هُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

آگ ان کے مونہوں کو جھلس دے گی اور وہ اس میں برے منہ بنائے ہوئے ہوں گے۔ (2299)

اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

کیا میری آیتیں تم پر نہ پڑھی جاتی تھیں۔ تو تم انہیں جھٹلاتے تھے۔

قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَ كُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾

کہیں گے اے ہمارے رب ہماری بدبختی ہم پر غالب آ گئی اور ہم گمراہ قوم تھے۔

رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

اے ہمارے رب! ہمیں اس سے نکال دے پھر اگر ہم دوبارہ یہ کام کریں تو ہم ظالم ہوں گے۔

قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾

کہے گا اسی میں ذلیل ہو کر پیچھے ہٹ جاؤ اور میرے ساتھ بات نہ کرو۔

اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

میرے بندوں میں سے ایک گروہ تھا وہ کہتے تھے ہمارے رب ہم ایمان لائے سو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے بہتر ہے۔

فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ

تو تم نے ان سے تمسخر کیا یہاں تک کہ (گویا) انہوں نے

2299- ﴿تَلْفَحُ﴾۔ لَفَحَ آگ یا سموم کے جھلس دینے پر بولا جاتا ہے۔ ﴿كٰلِحُوْنَ﴾۔ كُلُوْحٌ سخت ترش روئی ہے۔

ذِكْرِيْ وَ كُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

تمہیں میرا ذکر بھلا دیا اور تم ان پر ہنسی اڑاتے تھے۔(2300)

اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

آج میں نے انہیں ان کے صبر کا بدلہ دیا کہ وہی بامراد ہیں۔

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

کہے گا تم کتنے برس زمین میں رہے؟

قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾

کہیں گے ہم ایک دن یا دن کا کوئی حصہ رہے۔ سو گنتی کرنے والوں سے پوچھئے۔

قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

کہے گا تم رہے تو تھوڑا ہی، کاش تم جانتے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے اور کہ تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟(2301)

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾

سو اللہ بلند ہے، بادشاہ ہے، حق ہے۔ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں۔ وہ معزز عرش کا رب ہے۔

2300- ﴿سِخْرِيًّا﴾۔ سُخْرِيَّة اور سِخْرِيَّة تمسخر کرنے والے کا فعل ہے۔(غ)

﴿اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ﴾ ذکر کے بھلا دینے کو مومنوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ تمہارا ان سے استہزا اس قدر بڑھا کہ تم اللہ کے ذکر کو بالکل بھول گئے۔ گویا وہ ترک ذکر کا سبب بن گئے۔

2301- ﴿عَبَثًا﴾۔ عَبَث یہ ہے کہ اپنے عمل کے ساتھ کھیل ملائے ﴿اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾﴾[الشعرآء: 128:26] ''کیا تم ہر اونچی جگہ یادگاریں بناتے ہو، عبث کام کرتے ہو'' اور جس کی کوئی صحیح غرض نہ ہو اسے عَبَث کہا جاتا ہے۔(غ)

وَ مَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

اور جو کوئی اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو پکارے گا، جس کی اس کے پاس کوئی روشن دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے ہاں ہے۔ کافر ہی کامیاب نہیں ہوں گے۔

وَ قُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَ ارْحَمْ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ ع 6 26 6

اور کہہ، میرے رب! حفاظت فرما اور رحم کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے بہتر ہے۔

سورۃ النور

نام:

اس سورت کا نام اَلنُّوْرِ ہے اور اس میں 9 رکوع اور 64 آیات ہیں۔ اس کے پانچویں رکوع میں رسول اللہ ﷺ کے ظہور کو ایک اعلیٰ درجہ کے مصفّٰی دائمی اور کل عالم پر محیط نور سے تشبیہ دی ہے اور اسی لحاظ سے اس کا نام النور ہے۔

خلاصہ مضمون:

چونکہ اس سورت میں آنحضرت ﷺ کے ظہور کو کامل نور سے مشابہت دے کر یہ بتایا ہے کہ یہ نور دنیا پر غالب ہوگا اور اس لیے نہ صرف آنحضرت ﷺ کے لیے بادشاہت کی پیشگوئی ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ یہ بادشاہت دائمی طور پر آپ کے بعد بھی رہے گی اور چونکہ جب قوموں کو دنیا میں عروج اور حکومت ملتی ہے تو فسق و فجور ان کی تباہی کا موجب ہو جاتا ہے۔

① اس لیے اس سورت کی ابتدا سزائے زنا و قذف محصنات سے کی ہے۔ اور اسی پہلے رکوع میں بتایا ہے کہ زانیوں کو اپنی قوم میں نہ ملنے دو تا کہ تم خود اس سے بچے رہو۔

② دوسرے رکوع میں واقعہ افک کا ذکر کر کے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی بریت کی ہے۔

③ تیسرے رکوع میں بری باتوں کی تشہیر سے روکا ہے۔

④ چوتھے میں وہ علاج بتایا ہے جس سے قوم فسق و فجور سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ گھروں میں اجازت سے داخل ہونا، رستوں اور کاروبار کے اوقات میں مردوں اور عورتوں کا نظریں نیچی رکھنا، عورتوں کا اپنی زینت کے مقامات کو چھپانا، مجردوں کے نکاح کر دینا یہ چند تدابیر بتائی ہیں اور اگر کوئی قوم ان باتوں کو اختیار کرے اور ان کے اختیار کرنے میں دشواری بھی کوئی نہیں تو وہ زنا کے اس میں رواج پانے سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

⑤ پانچویں رکوع میں بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ظہور کامل ترین نور الٰہی کا ظہور ہے اور وہ دائمی اور کل عالم پر محیط نور ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ صحابہ کے گھروں میں یہ نور پھیل گیا ہے اور اس کے منکر اپنے آپ کو ظلمت میں رکھتے ہیں۔

⑥ چھٹے رکوع میں نظارہ قدرت کی کچھ مثالیں دے کر بتایا ہے کہ حق آخر کار کامیاب ہوگا، مگر اس کے لیے ضرورت ہے کہ سچے دل سے اتباع نبوی کیا جائے۔

⑦ ساتویں میں اطاعت رسول کے مضمون کو جاری رکھتے ہوئے بتایا ہے کہ اس نور کے قیام کے لیے بادشاہت بھی دی جائے گی اور وہ بادشاہت صرف آنحضرت ﷺ کی ذات تک محدود نہ ہوگی بلکہ آپ کے بعد بھی قائم رہے گی اور خلافت کے مضمون میں

خلافت جسمانی اور خلافت روحانی دونوں کا ذکر کیا ہے۔

⑧ آٹھویں رکوع میں مضمون کو پھر اس طرف لوٹایا ہے کہ چھوٹے چھوٹے خانگی امور کو لاپروائی کی نظر سے نہ دیکھا جائے، بلکہ ان میں صحیح راہ پر چلنے پر بھی انسان کی راحت کا بہت کچھ دارومدار ہے۔ گویا یہ رکوع چوتھے رکوع کے مضمون کی تکمیل کرتا ہے اور

⑨ نویں رکوع میں اصولی بات بتائی کہ دینی اور قومی معاملات کو ذاتی معاملات پر ترجیح دینی ضروری ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے جس امر کی طرف دعوت دی ہے اسے معمولی امر نہ خیال کیا جائے، بلکہ اسی میں فلاح ہے اور اسے چھوڑ کر نتیجہ اس دنیا میں بھی دکھ ہوگا۔

تعلق:

اس سورت کا تعلق پچھلی سورت سے ظاہر ہے۔ وہاں مومنوں کی فلاح کی اصل باتوں کو بیان کیا تھا تو یہاں یہ بتایا ہے کہ کون سی باتیں ہیں جو ایک کامیاب قوم کی تباہی کا موجب ہوجاتی ہیں۔ اصل علاج انہی کا بتایا ہے۔ اسی اثنا میں نہایت صفائی سے یہ بھی ذکر کر دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا نور کل عالم پر محیط ہوجائے گا اور آپ کے بعد آپ کے جانشینوں کو حکومت بھی دی جائے گی۔

تاریخ نزول:

یہ سورت بالاتفاق مدنی ہے اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے افک کے واقعہ جس کا اس میں ذکر ہے پانچویں سال ہجرت کا ہے۔ اس لیے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ بیشتر حصہ اس سورت کا پانچویں سال ہجرت کا ہے۔

اٰیَاتُھَا 64 (24) سُوْرَۃُ النُّوْرِ مَدَنِیَّۃٌ (102) رُکُوْعَاتُھَا 9

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَ فَرَضْنٰهَا وَ اَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ①

(یہ) ایک سورت ہے جسے ہم نے اتارا ہے اور اس (کے احکام) کو ضروری ٹھہرایا اور اس میں کھلے کھلے حکم اتارے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔(2302)

اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَ لْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ②

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد (کے لیے حکم یہ ہے) کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ، اور ان پر مہربانی تمہیں اللہ کے حکم کی تعمیل سے نہ روکے، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہو، اور چاہیئے کہ ان کی سزا کے وقت مومنوں کی ایک جماعت موجود ہو۔(2303)

2302- سبھی سورتیں اللہ تعالیٰ نے اتاریں اور سبھی کے احکام کو فرض بھی کیا اور ان کو عمل میں لانا ضروری ٹھہرایا۔ خاص طور پر اس سورت کے متعلق یہ الفاظ اس لیے فرمائے کہ ان کی طرف زیادہ توجہ ہو، کیونکہ ان احکام کے مدنظر رکھنے سے مومن کا گھر اس کے لیے جنت بن جاتا ہے اور ان کی خلاف ورزی سے سب آرام اور امن تباہ ہو جاتا ہے۔ مگر یہ افسوس کا مقام ہے کہ اسی سورت کے احکام کو مسلمانوں نے سب سے زیادہ چھوڑ رکھا ہے۔ حالانکہ ان کی تعمیل میں کوئی بڑی مشکلات بھی نہیں۔

2303- زَانِيَةٌ۔ زَانِي۔ زِنا بغیر عقد شرعی کے عورت کے ساتھ ہمبستری کا نام ہے۔ (غ)

سزا میں کس قسم کا کوڑا استعمال ہو:

اِجْلِدُوْا۔ جَلْدَةٍ۔ جِلْد چمڑے کو کہتے ہیں۔ جس کی جمع جُلُود ہے۔ ﴿جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ﴾ [الزمر: 23:39] ''بدن کانپ اٹھتے ہے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔'' اور جَلَدَہ کے معنی ہیں [ضَرَبَ جلدہ] اس کی جلد پر مارا اور [ضَرَبَه بِالجِلدِ] اسے چمڑے کے ساتھ مارا۔ (غ) اور یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔ (ر) اور جلد مصدر ہے کسی چیز کے ساتھ مارنا اور

جَلَدَہ کے معنی ہیں[اَصَابَ جِلْدِہٖ]اس کی جِلد یعنی چمڑے کو پہنچا۔(ل)اور روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ زانیہ اور زانی کو ایسے کوڑے کے ساتھ مارا جاتا تھا جس پر گانٹھ کوئی نہ ہوتی تھی اور نہ اس کی کوئی شاخ ہوتی تھی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس قسم کے کوڑے کے ساتھ مارنا بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اجماع صحابہ سے شروع ہوا اور اس سے پہلے کبھی ہاتھ سے مارا جاتا تھا اور کبھی جوتی سے اور کبھی تازہ شاخ سے۔(ر) پھر یہ مارنا کپڑے اتار کر اور ننگا کر کے نہیں بلکہ شافعی اور احمد کا قول ہے کہ اس پر ایک یا دو قمیصیں چھوڑ دی جائیں، اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے ایک شخص کو حد لگائی اور اس پر قسطلانی کپڑا تھا اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہے کہ اس امت میں تجرید یعنی ننگا کرنا اور مدّ یعنی کھینچنا یا کسی چیز سے باندھنا جائز نہیں۔ البتہ پوستین یا روئی دار کپڑا اوپر سے پہنا ہوا ہو تو وہ اتروا دینا چاہئے۔ کیونکہ ایسی صورت میں مار کا اثر چمڑے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور مناسب ہے کہ سختی سے نہ مارا جائے اور بعض کے نزدیک صرف پیٹھ پر مارنا چاہئے اور بعض کے نزدیک سوائے سر اور منہ اور ایسی جگہ کے جس پر مارنے سے ہلاکت کا خطرہ ہو تمام اعضاء پر تقسیم کر کے مارنا چاہئے۔

اسلامی سزائے جَلْد اور آج کل کا کوڑا:

جَلْد کی اس کیفیت سے معلوم ہوگا کہ جو آج کل کوڑے یا دُرّے کا مفہوم ہے وہ جِلْد کا مفہوم ہرگز نہیں۔ بلکہ اس سے مراد صرف اس قدر ہے کہ کوئی ایسی چوٹ مارنی چاہئے جس کی تکلیف انسان کی جلد کو پہنچے، ننگے کر کے مارنا بالکل ناجائز ہے اور شدید مار مارنا بھی درست نہیں۔ اور کھڑے ہوئے انسان کو بغیر باندھنے کے مارنا صاف بتاتا ہے کہ کوڑے اور درّے کی مار سے اس جِلْد کو کوئی نسبت ہی نہیں۔ اور اصل غرض زیادہ تر رسوائی ہے اور اسی لیے یہ بھی ضروری ٹھہرایا ہے کہ ایک جماعت اس وقت موجود ہو، تا ایسا بدفعل کرنے والے کی تشہیر ہو۔ وہ وحشیانہ سزا جو ایک مہذب قوم کی سزاؤں میں کوڑے مارنے کے رنگ میں تعزیرات ہند میں موجود ہے وہ تعلیم اسلامی کی روح کے سراسر منافی ہے۔ اسلام نے جِلْد کی سزا صرف چند خاص جرائم میں رکھی ہے یعنی زنا یا قذف یا شراب خوری۔ اور یہ جِلْد محض رسوائی کے طور پر ہے اور اس کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ ایک شخص کو مار مار کر ادھ موا کر دیا جائے اور ایسی سزا دی جائے جس کے داغ ساری عمر اس کی پیٹھ پر رہیں اور اس کا گوشت اڑا کر ہڈیوں کی چربی تک صاف کر دی جائے۔

کیا رجم اسلام میں سزائے زنا ہے:

یہاں ایک نہایت ضروری سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا رجم یعنی سنگسار کرنا بھی زنا کی سزا ہے یا نہیں۔ جہاں تک تعلیم قرآنی کا تعلق ہے سوائے اس ایک آیت کے اور کہیں زنا کی سزا کا ذکر نہیں۔(سوائے اس کے کہ لونڈی اگر زنا کرے تو اس کی سزا آزاد عورت سے نصف ہے۔) اور اس ایک آیت میں اس قدر واضح الفاظ میں زانی اور زانیہ کی سزا بتا دی ہے کہ ادنیٰ شبہ کی گنجائش نہیں۔ اور زنا کا لفظ بھی زبان عربی میں وسیع ہے یعنی ہر ناجائز ہمبستری پر بولا جاتا ہے۔ خواہ ایسے لوگوں میں ہو جن کے زوج یا زوجہ موجود ہوں۔ اور خواہ ایسے لوگوں میں ہو جن کے ابھی نکاح نہ ہوئے ہوں۔ لغت ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتی۔ لیکن تعامل اور احادیث دونوں میں بیاہے ہوؤں کے لیے سزا رجم ہے اور بن بیاہوں کے لیے سو جِلْد۔ اور پھر بعض نے کہا کہ بیاہے ہوؤں کے لیے جِلْد اور رجم دونوں ہیں اور بعض نے صرف رجم کہا ہے اور ایسا ہی بن بیاہوں کے لیے

بعض نے صرف جِلْد سزا قرار دی ہے اور بعض نے کسی حدیث کی بنا پر جِلْد کے علاوہ ایک سال کی جلاوطنی بھی بتائی ہے۔
اب سوال یہ ہے کہ قرآن شریف کے صریح الفاظ کے بالمقابل کون سی سند ہے جس کی بنا پر سنگساری کی سزا دی جاسکتی ہے۔

آیت رجم کے متعلق سیدنا عمرؓ کا قول:

اول وہ روایات جن میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے کہ قرآن شریف میں کوئی آیت رجم کے متعلق تھی۔ایک روایت میں جو صحیحین میں ہے یہ ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: [فَكَانَ مِمَّا أَنْزَلَ اللهُ آيَةُ الرَّجْمِ، فَقَرَأْنَاهَا وَعَقَلْنَاهَا وَوَعَيْنَاهَا، رَجَمَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَرَجَمْنَا بَعْدَهُ، فَأَخْشَى إِنْ طَالَ بِالنَّاسِ زَمَانٌ أَنْ يَقُولَ قَائِلٌ وَاللهِ مَا نَجِدُ آيَةَ الرَّجْمِ فِي كِتَابِ اللهِ، فَيَضِلُّوا بِتَرْكِ فَرِيضَةٍ أَنْزَلَهَا اللهُ.] (صحيح البخاری، كتاب المحاربين، باب رَجْمِ الْحُبْلَى مِنَ الزِّنَا إِذَا أَحْصَنَتْ، حديث: 6830) یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اپنے رسول پر اتارا اس میں آیت رجم بھی تھی سو ہم نے اسے پڑھا اور اسے یاد کیا اور رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔سو میں ڈرتا ہوں کہ لوگوں پر لمبا زمانہ گزر جائے تو کوئی کہنے والا کہے کہ ہم آیت رجم کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔پس ایک فریضہ کے ترک کی وجہ سے گمراہ ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے۔اور امام احمد کی روایت میں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا اور فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں رجم کا حکم کتاب اللہ میں نہیں۔اس میں جِلْد ہے۔اور اگر کوئی یہ کہنے والا نہ ہوتا کہ عمر نے کتاب اللہ میں وہ بات بڑھا دی جو اس میں سے نہیں ہے تو میں اسے لکھ دیتا جس طرح اس کا نزول ہوا۔اور امام احمد کی ایک اور روایت میں ہے کہ اگر کہنے والے یہ نہ کہتے کہ عمر نے کتاب اللہ میں ایسی بات بڑھا دی ہے جو اس میں سے نہیں ہے تو میں قرآن شریف کے ایک کونہ میں یہ لکھ دیتا۔یہ ایک ایسی کچی بات ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی قبول نہیں کی جاسکتی اور نہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہوسکتی ہے۔قرآن شریف میں ایک آیت اترتی ہے، لوگ اسے پڑھتے ہیں، یاد بھی رکھتے ہیں۔پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں اسے قرآن میں نہیں لکھ سکتا، کیونکہ لوگ کہیں گے کہ عمر نے کتاب اللہ میں بڑھا دیا۔بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس خوف سے اسے نہیں لکھا کہ لوگ ایسا کہیں گے۔مگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جیسا جری القلب انسان لوگوں سے ڈر کر کس طرح ایک حق بات کو ترک کرسکتا تھا اور پھر یہ کیونکر ہوسکتا تھا کہ سوائے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اور کسی کو اس آیت کا علم بھی نہ ہوتا۔

آیت رجم کی تلاوت کی منسوخی اور بقائے حکم کا خیال:

اور یہ جوان بے معنی الفاظ کی توجیہہ کی گئی ہے کہ اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی تھی اور حکم باقی رہ گیا تھا تو یہ اصل قول سے بھی بڑھ کر بے معنی ہے۔آخر اس کا مطلب کیا ہے کہ ایک حکم تو باقی ہے مگر اس کے لفظ باقی نہیں یا کم از کم پڑھے نہیں جاسکتے یا قرآن کریم کا حصہ نہیں رہے۔جو حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا رہا ہے جب سے دنیا ہوئی الفاظ میں ہی آتا رہا ہے۔اب ایک حکم الفاظ میں اترتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ حکم تو باقی ہے مگر لفظ نہیں رہے۔پہلے ہی بغیر لفظوں کے اترآتا تو کچھ بات ہوتی لیکن یہ گورکھ دھندا کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ حکم لفظوں میں اترا۔کیونکہ بغیر لفظوں کے اتر نہ سکتا تھا۔پھر لفظ منسوخ ہوگئے اور حکم رہ گیا۔کیا وہ حکم صحیح تھا اور لفظ غلط تھے؟ آخر بات وہ کہنی چاہئے جو عقل انسانی میں آسکے اور منسوخ التلاوۃ کے بارے میں جن کا حکم

منسوخ نہ ہو۔ اتقان میں یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ایسی روایات سب خبر احاد ہیں۔ اور خبر احاد سے نہ نزول قرآن ثابت ہوتا ہے اور نہ اس کا نسخ اور یہی مذہب معقول ہے۔

نہ صرف عقل بالبداہت اس بات کو غلط ٹھہراتی ہے بلکہ صحابہ میں سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ جیسے انسان کی شہادت اس کے خلاف ہے۔ کیونکہ انہوں نے جب ایک شادی شدہ عورت شراحہ پر حد لگائی تو جلد اور رجم دونوں کا حکم دیا اور فرمایا کتاب اللہ کے ساتھ میں نے اسے جلد کیا اور سنت رسول اللہ کے ساتھ رجم کیا۔ اگر کتاب اللہ کی آیت کا حکم باقی ہوتا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کس طرح اس سے بے خبر رہ سکتے تھے۔ پس اب دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا رجم واقعی سنت رسول اللہ ﷺ ہے اور اس نے کتاب اللہ کے حکم در بارہ محصن کو منسوخ کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن کریم نے بعض احکام کی تفصیلات بیان نہیں کیں۔ تو سنت رسول اللہ نے ان تفصیلات پر ہم کو آگاہ کر دیا۔ مثلاً ﴿اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ حکم قرآن ہے۔ سنت نے بتا دیا کہ کون کون سی نمازیں کن کن اوقات میں ہیں اور کتنی کتنی رکعات ہیں۔ لیکن یہاں تو تفصیلات کا کوئی سوال نہیں۔ ایک حکم موجود ہے اور صاف الفاظ میں موجود ہے۔ زانی مرد اور زانی عورت کو سو دفعہ جلد کرو یا سو کوڑے لگاؤ۔ تو یہاں تفصیل کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ سزا بتانا مقصود ہے اور وہ بتا دی ہے۔ ہاں اگر یوں ہوتا کہ زانیوں کو کچھ سزا دو اور سنت تشریح کر دیتی تو ٹھیک تھا۔ یا یوں ہوتا کہ زنا کی سزا جلد اور رجم ہے اور سنت میں تفصیل ہو جاتی کہ جلد فلاں کے لیے ہے اور رجم فلاں کے لیے، تو بھی ہو سکتا تھا۔ یا اگر یہاں زنا کی سزا کے ذکر کے علاوہ کہیں اور بھی زنا کی سزا کا ذکر ہوتا اور وہ صراحت سے رجم نہ ہوتا اور سنت اسے رجم قرار دیتی تو بھی ماننے کے قابل بات تھی۔ لیکن سنت قرآن کو منسوخ کر دے یہ نا قابل تسلیم بات ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں ایک حکم نازل کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ اس کے خلاف حکم دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ احادیث میں رجم کی سزا کا ذکر ہے مگر یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک خاص رجم کا واقعہ اس آیت کے نزول کے بعد کا ہے اور جب تک یہ ثابت نہ ہو اس وقت تک یہ دعویٰ ثابت نہیں کہ سنت نے قرآن کو منسوخ کر دیا۔ اتنا عظیم الشان دعویٰ کہ نبی کریم ﷺ کا عمل قرآن کو منسوخ کر دے حالانکہ قرآن میں صاف لکھا ہو ﴿اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ﴾ ایسی فرضی باتوں سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ ہمیں علم نہیں کہ رجم کا حکم نبی کریم ﷺ نے اس آیت کے نزول کے بعد دیا۔ اس لیے ہم یونہی تسلیم کریں گے کہ جب قرآن شریف میں زنا کے لیے جلد کا حکم آ گیا تو پھر نبی کریم ﷺ نے اس کے خلاف عمل نہیں کیا۔ ہاں اس کے نزول سے پہلے شریعت سابقہ کے مطابق اگر رجم کیا ہو تو یہ امر دیگر ہے۔ الگ الگ احادیث پر بحث کی یہاں گنجائش نہیں۔

اجماع سے قرآن منسوخ نہیں ہو سکتا، رجم پر اجماع امت نہیں:

تیسری بات جو اس بارہ میں کہی جاتی ہے وہ اجماع ہے۔ اجماع اصل میں کوئی دلیل نہیں اور کم از کم اس پر تو اتفاق ہے کہ اجماع ناسخ نہیں اور یہاں بغیر نسخ کے کام نہیں بنتا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ رجم پر اجماع کیونکر کہا جا سکتا ہے جب صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی بعض لوگ ایسا کہتے تھے کہ رجم کا حکم کتاب اللہ میں نہیں، اس لیے سزائے رجم نہیں دی جا سکتی۔ [وَإِنَّ نَاسًا يَقُولُونَ مَا بَالُ الرَّجْمِ وَإِنَّمَا فِي كِتَابِ اللهِ الْجَلْدُ] (مسند أحمد، جلد1،

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۪ وَّ الزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

بدکار مرد سوائے بدکار یا مشرک عورت کے کسی سے تعلق پیدا نہیں کرتا اور بدکار عورت کے ساتھ سوائے بدکار مرد یا مشرک کے کوئی تعلق پیدا نہیں کرتا اور یہ مومنوں پر حرام کیا گیا ہے۔ (2304)

صفحہ 427) یہ روایت احمد کے الفاظ ہیں۔ مروان کے سامنے بھی کوئی ایسا ہی ذکر ہوا، پھر عمر بن عبدالعزیز کے سامنے بھی یہی قصہ پیش آیا۔ پھر خوارج سارے کے سارے رجم کے منکر ہیں، تو اسے اجماع کہنا صحیح نہیں۔ اصل پرکھ یہی ہے کہ ایک بات کتاب میں ہے یا نہیں۔ اگر کتاب اللہ میں صراحت سے ہے تو کوئی حدیث اس کے خلاف قبول نہیں کی جاسکتی۔ اگر کتاب اللہ میں اجمال ہے یا مسئلہ نہیں تو حدیث سے لیں گے۔ اس کے بعد قیاس ہے اور بس۔ سو یہ بات کہ رجم زنا کی سزا ہے پہلے معیار پر ہی غلط ٹھہرتی ہے۔ اس لیے یہاں نہ حدیث کی ضرورت ہے نہ قیاس کی۔ اور خلاف تصریح قرآن کریم جو حدیث یا قیاس ہو وہ قبول نہیں کیا جاسکتا اور اجماع محض ایک وقتی حادثہ کا فیصلہ ہوتا ہے۔

لونڈیوں کو سزائے زنا نصف دینے سے استدلال کہ رجم سزائے زنا نہیں ہوسکتا:

قرآن کریم کے دوسرے مقام سے اسی نتیجہ کی تائید ہوتی ہے۔ سورۂ نساء میں جہاں لونڈیوں کے نکاح کے احکام ہیں وہاں یہ بھی ذکر ہے کہ اگر لونڈیاں نکاح کے بعد ارتکاب زنا کریں تو ان کے لیے اس کی نصف سزا ہے جو محصنات کے لیے ہے۔ ﴿فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ﴾ [النسآء: 25:4] ''پھر جب وہ نکاح میں لائی جائیں تو اگر بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان کے لیے آزاد عورتوں کی سزا سے آدھی ہے۔'' اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف سو جَلْدَۃٍ کی سزا ہے، جس کا نصف ہوسکتا ہے۔ اگر رجم بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس شریعت میں سزائے زنا ہوتی تو ﴿نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ﴾ کا لفظ استعمال نہ کیا جاتا۔ پس قرآن کریم کی یہ دوسری آیت بھی صاف بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک رجم زنا کی سزا نہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ سزا کے وقت مومنوں کی ایک جماعت موجود ہو تو اس میں اقل تعداد بعض کے نزدیک ایک، بعض کے نزدیک دو، بعض کے نزدیک تین اور بعض کے چار ہے۔ طَآئِفَةٌ کا لفظ چونکہ جماعت کو چاہتا ہے، اس لیے تین یا زیادہ پر ہی اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

2304- اس آیت کے معنی میں تین قول ہیں۔ اول یہ کہ اس میں یہ حکم ہے کہ اہل قبلہ میں سے ہو کر جو زنا کرے اس کا نکاح سوائے زانیہ یا مشرک عورت کے دوسری سے نہیں ہوسکتا۔ یعنی ایک پاک دامن مومن عورت اس کے نکاح میں نہیں دی جاسکتی۔ اور ایسا ہی زانیہ عورت ایک پاک دامن مرد کے نکاح میں نہیں دی جاسکتی، اور اس کا نکاح صرف زانی مرد یا مشرک سے ہوسکتا ہے۔ اور

ایک حدیث بھی ہے [لَا يَنْكِحُ الزَّانِي الْمَجْلُودُ إِلَّا مِثْلَهُ] (سنن أبی داؤد، کتاب النکاح، باب فِي قَوْلِهِ تَعَالَى (الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً)، حدیث: 2054) زانی جسے سزائے زنا دی گئی ہے وہ اپنی ہی مثل کسی عورت سے نکاح کرسکتا ہے۔اور یہ بھی مسلّم ہے کہ زنا ایک ایسا عیب ہے کہ زن وشوہر میں سے ایک فریق اگر زنا کا ارتکاب کرے تو نکاح باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا پھر ارتکاب زنا کیا اور اس پر حد قائم ہوئی تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے حکمًا اس کو بی بی سے الگ کردیا اور فرمایا: [لاَ تَتَزَوَّجْ إِلاَّ مَجْلُودَةً مِثْلَكَ] (سنن البیهقی الکبری، جلد7، صفحہ 156) تو اپنے ہی جیسی کسی زانیہ عورت سے نکاح کرسکتا ہے۔اور بعض علماء کے نزدیک ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرے پھر اس پر اس کا زانیہ ہونا ثابت ہوجائے تو اسے اختیار ہے کہ اس کے نکاح میں رہے یا طلاق لے لے۔لیکن اس میں دقت یہ ہے کہ یہاں زانیہ یا مشرک دونوں سے نکاح کا بظاہر جواز ہوا، حالانکہ مشرک عورت سے مسلمان مرد کا نکاح جائز نہیں۔ نہ ہی مسلمان عورت کا نکاح مشرک مرد سے جائز ہے۔

زانی اور زانیہ کا نکاح:

اور بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جو شخص کسی عورت سے زنا کرے پھر اس کا نکاح اس کے ساتھ جائز نہیں۔ گو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے وہ اس کے خلاف ہے یعنی آپ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جو ایک عورت سے زنا کرے اور پھر اسے نکاح میں لانا چاہے۔تو آپ نے فرمایا حرام حلال کو حرام نہیں کردیتا۔اور پھر بعض لوگوں نے اسی معنی کو لے کر یہ کہا ہے کہ یہ آیت ﴿وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ﴾ کے حکم سے منسوخ ہے۔لیکن اس مسئلہ میں صحیح راہ یہ نظر آتی ہے کہ جب ایک زانی یا زانیہ توبہ کرے یہاں تک کہ اس کی نیکی کی وجہ سے وہ نام اس پر باقی نہ رہے تو ایسے شخص کا معاملہ بوجہ توبہ کے ایک سچے مسلمان کی طرح ہونا چاہئے اور آیت کا منسوخ ہونا غلط ہے۔لیکن بہرحال مشرک اور مشرکہ کو زانی اور زانیہ کے حکم میں رکھنے سے جو دقت پیش آتی ہے وہ باقی رہتی ہے۔

کسبیوں سے نکاح جائز نہیں:

دوسرا قول آیت کے معنی میں یہ ہے کہ یہ صرف ان زانیہ عورتوں کے بارہ میں ہے جو ایام جاہلیت میں زنا کا پیشہ کرتی تھیں۔ تو جب لوگ مسلمان ہوئے اور انہوں نے ان سے قطع تعلق کرلیا تو بعض کے دل میں یہ خیال آیا کہ ان عورتوں سے نکاح کرلیں، تو ایسے نکاح کو اس آیت کی رُو سے منع کیا گیا۔لیکن آیت کے معنی اس حد تک محدود کرنے میں یہ دقت ہے کہ اگر زانیہ عورتوں سے مراد صرف پیشہ ور عورتیں ہیں تو زانی مرد کون ہوئے۔اور مشرکہ کی دقت جس کا ذکر اوپر ہوا اسی طرح باقی رہتی ہے۔ ہاں یہ شبہ درست ہے کہ مفہوم اس آیت یا ایسی پیشہ ور عورتوں سے نکاح کو شامل رکھتا ہے یعنی اسے ناجائز قرار دیتا ہے جب تک کہ وہ پیشہ سے توبہ کرکے ایک ایسی نیک زندگی بسر نہ کریں، جو زانیہ کے نام کو ان سے دور کردے۔اور اکثر لوگ جو پہلے کسبیوں سے تعلق پیدا کرلیتے اور پھر جھٹ پٹ ان سے نکاح کرلیتے ہیں اس کے خلاف کرتے ہیں۔

وَ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ(۴)

اور جولوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ نہ لائیں، تو انہیں اَسّی کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو، اور وہی نافرمان ہیں۔ (2305)

آیت کا صحیح مفہوم:

تیسرا قول یہ ہے کہ لفظ نکاح یہاں اپنے وسیع معنی میں ہے۔ یعنی مراد اس سے ایک مرد اور ایک عورت کا جمع ہونا ہے اور عقد شرعی مراد نہیں۔ اور یہ معنی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ اور لغت میں لفظ نکاح اس معنی میں آتا ہے۔ [دیکھو نمبر: 284] تو اس صورت میں معنی صاف ہیں کہ زنا کرنے والا مرد کسی پاکدامن مومن عورت سے ناجائز تعلق پیدا نہیں کرسکتا۔ اگر کرے گا تو کسی زانیہ عورت سے ہی کرے گا یا کافر عورت سے۔ اور ایسا ہی حال زنا کرنے والی عورت کا ہے۔ گویا اسلام انسان کا مرتبہ اس قدر بلند کر دیتا ہے کہ وہ ارتکاب زنا سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ ہاں چونکہ ناپاک انسان بھی بیچ میں ہی ہوتے ہیں اس لیے اگر ایسا کوئی ناپاک خیالات کا مرد ہے تو وہ اپنے جیسی ہی کسی ناپاک خیالات کی عورت کو پھسلا سکتا ہے یا کسی کافر عورت کو۔ اور ایسا ہی کوئی ناپاک خیالات کی عورت کسی ناپاک خیالات کے مرد کو ہی پھسلا سکتی ہے یا کسی مشرک مرد کو۔ اور ﴿حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ کے معنی ہوں گے کہ زنا مومنوں پر حرام ہے۔ البتہ میرے نزدیک لفظ نکاح دونوں معنوں کو شامل رکھتا ہے۔ یعنی اس سے مراد مرد اور عورت کا جمع ہونا ہے خواہ عقد شرعی سے ہو یا اس کے بغیر، اور اس طرح پر جو پہلے دو معنی بیان ہوئے ہیں وہ بھی اس آیت کے حکم میں شامل ہو جاتے ہیں۔

علانیہ زنا کرنے والوں کا برادری سے اخراج:

اس آیت نے زنا کو ایک ایسا عیب قرار دیا ہے جو مرد یا عورت اس کا ارتکاب کرے وہ گویا اسلامی برادری سے ایک گونہ خارج ہو جاتا ہے، گو اسے کافر یا دائرہ اسلام سے خارج قرار نہ دیا جائے۔ کیونکہ اس کا نکاح پاک دامن مسلمان سے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ آج اسلامی برادری کس حالت تک گر گئی ہے کہ علانیہ زنا کرنے والے کو برادری میں وہ عزت حاصل ہے جو ایک پاک دامن کا حق ہے۔ کاش مسلمان اس عملی پہلو کے لیے تھوڑی سی کوشش کریں اور جس کا زنا ثابت ہو جائے اسے اپنی برادری سے خارج کر دیں تو یہ برادری پاک دامنی کے اسی بلند مقام پر کھڑی ہو سکتی ہے جہاں آنحضرت ﷺ نے اسے کھڑا کیا تھا۔

2305- ﴿یَرْمُوْنَ﴾۔ رَمْی کا لفظ جواہر پر بولا جاتا ہے جیسے تیر یا کنکر کا پھینکنا۔ ﴿وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ﴾ [الأنفال: 17:8] ''اور جب تو نے پھینکا تو تُو نے نہیں پھینکا۔'' اور کسی کے متعلق بات کہنے پر بھی اس کا استعمال ہے۔ جب یہ گالی دینے کے معنی میں ہوتا ہے جیسے تہمت لگانا۔ (غ) اور یہاں مراد زنا کی تہمت ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۵

مگر جو بعد میں توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّاۤ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝۶

اور جولوگ اپنی عورتوں پر تہمت لگائیں اور سوائے اپنے ان کا کوئی گواہ نہ ہو تو ان (تہمت لگانے والوں) میں سے ایک کی گواہی یہ ہے کہ اللہ کی قسم کے ساتھ چار بار گواہی دے کہ وہ سچوں میں سے ہے۔

وَ الْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَیْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ۝۷

اور پانچویں (بار یہ کہ) اللہ کی لعنت اس پر ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہے۔

وَ یَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِیْنَ ۝۸

اور عورت سے یہ بات سزا کو ٹال سکتی ہے کہ وہ اللہ کی قسم کے ساتھ چار بار گواہی دے کہ وہ (مرد) جھوٹوں میں سے ہے۔

زنا کی تہمت:

جس طرح سزائے زنا سخت رکھی ہے اسی طرح اس بات کی سزا بھی سخت رکھی ہے کہ خواہ مخواہ دوسروں پر الزام دیا جائے اور گو یہاں صرف محصنات پر تہمت دینے کا ذکر ہے۔ مگر مرد بھی اس میں شامل ہیں۔ صرف عورتوں کا ذکر اس لیے کیا کہ عورتوں کے متعلق بری باتوں کی اشاعت کو زیادہ سختی سے روکنے کی ضرورت ہے اور چار گواہوں کو اس لیے ضروری ٹھہرایا تاکہ اس بات کے سچ ہونے میں کوئی شبہ نہ رہے۔ ہاں یہ قاضی یا مجسٹریٹ کی رائے پر انحصار ہے کہ قرائن کو بھی شہادت میں شامل کرلے۔ یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اگر ایک شخص ہی دیکھے اور اسے گواہ نہ ملیں تو وہ کیا کرے۔ حکم قرآنی یہ ہے کہ ایسی صورت میں اسے تشہیر کا کوئی حق نہیں سوائے اس کے کہ وہ اپنی عورت سے ایسے فعل کا ارتکاب دیکھے جس کا علاج [آیت:6] میں بتایا ہے۔ کیونکہ اگر اسی طرح اسے تشہیر کا حق دے دیا جائے تو پھر ہر شخص جو چاہے کہتا پھرے، اور اس کے مضرات بہت زیادہ ہیں۔ اور ایسے تہمت لگانے والوں کی سزا علاوہ کوڑوں کے یہ بھی ہے کہ ان کی شہادت کسی معاملہ میں قبول نہ کی جائے۔ سوائے اس کے کہ وہ توبہ کریں اور بعض لوگوں نے یہاں تک کہا ہے کہ توبہ کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے ہے، شہادت پھر بھی قبول نہ ہوگی۔ مگر یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔

وَ الْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۹

اور پانچویں (بار یہ) کہ اللہ کا غضب اس پر ہو اگر وہ سچوں میں سے ہے۔ (2306)

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ وَ اَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰ ع

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور اللہ رجوع برحمت کرنے والا حکمت والا ہے۔ (2307)

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ

جو جھوٹ بنا لائے تم ہی میں سے ایک گروہ ہے۔ (2308) اسے اپنے لیے برا نہ سمجھو بلکہ وہ تمہارے لیے اچھا ہے۔

2306- ان چار آیتوں میں جو صورت بیان کی گئی ہے وہ لعان کی صورت ہے۔ اور پانچ مرتبہ قسم اٹھانا اس لیے ہے کہ تا دل پر واقعہ کے جھوٹ ہونے کی صورت میں خوف طاری ہو۔ لعان کے ساتھ شوہر اور عورت میں مفارقت لازم ہے اور ان کا نکاح دوبارہ نہیں ہوسکتا۔ سب سے پہلا لعان ہلال بن امیہ کا اس کی بی بی سے ہوا اور لکھا ہے کہ یہ آیات اسی کے معاملہ میں نازل ہوئیں۔

2307- ﴿وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ﴾ یہاں بھی بغیر جواب کے مذکور ہے اور دوسرے رکوع کے آخر میں بھی بغیر جواب کے مذکور ہے۔ یعنی [آیت:20] میں۔ اور تیسرے رکوع کی پہلی آیت میں بھی یہی الفاظ دہرا کر جواب دیا ہے ﴿وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا﴾ یعنی اللہ کے فضل اور رحمت سے آنحضرت ﷺ مبعوث ہوئے اور تمہیں پاک کیا گیا۔ ورنہ زنا سے ملک عرب کی حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اس پر فخر کیا جاتا تھا۔

2308- **واقعہ افک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا:** یہ واقعہ جس کی طرف یہاں اشارہ ہے، سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر وہ بہتان ہے جو منافقوں نے باندھا اور چند مسلمان بھی اس کے دہرانے میں ملوث ہو گئے۔ اس کے جھوٹ اور منافقوں کا بنایا ہوا ہونے کی طرف دو لفظوں میں اشارہ کیا۔ اِفْكٌ۔ عُصْبَةٌ وہ چیز ہے جو اس حالت سے پھیر لی گئی ہو جس پر اسے ہونا چاہئے [دیکھو نمبر: 986] یا حق سے باطل کی طرف پھیری ہوئی بات۔ یعنی ایک سیدھے سادے واقعہ کو توڑ مروڑ کر اس پر ایک باطل بنا کھڑا کیا۔ اور عُصْبَةٌ وہ گروہ ہے جو ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہوں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ منافقوں کا گروہ تھا جو اسلام کے خلاف ایک دوسرے کے مددگار تھے۔ اور مِّنْكُمْ اس لیے کہا کہ منافق بظاہر اسلام کا اقرار کرتے تھے۔

یہ واقعہ جس کی طرف اشارہ ہے پانچویں سال ہجرت کا ہے جب نبی کریم ﷺ غزوہ بنی مصطلق سے واپس آ رہے تھے اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی بخاری میں مذکور ہے، یہاں باختصار درج کیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ جب سفر پر نکلا کرتے تو قرعہ اندازی سے ایک بی بی کو ساتھ لیتے، اس غزوہ میں یہ قرعہ میرے نام کا نکلا، سو میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلی اس کے بعد کہ آیت حجاب نازل ہو چکی تھی۔ (اس سے معلوم ہوا کہ حجاب ضروریات جنگ اور دیگر ضرورتوں کے لیے عورتوں کو باہر نکلنے سے

خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ⑪

ان میں سے ہر شخص کے لیے وہی ہے جو اس نے گناہ کمایا اور ان میں سے جس نے اس کا بڑا بوجھ اپنے اوپر لیا، اس کے لیے بڑا دکھ ہے۔ (2309)

نہیں روکتا۔) واپسی پر جب ہم مدینہ کے قریب تھے تو رات کے وقت کوچ کا اعلان ہوا۔ میں قضائے حاجت کے لیے لشکر سے باہر نکل گئی۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے میں نے دیکھا کہ میرا ہار گر گیا ہے اور اسے ڈھونڈنے لگی۔ ادھر قافلہ والوں نے میرا ہودہ اونٹ پر رکھ دیا اس خیال سے کہ میں اس کے اندر ہوں، اور اس وقت عورتیں بہت ہلکی پھلکی تھیں۔ کیونکہ کھانے کو بہت کم ملتا تھا اور میں تھی بھی نوعمر لڑکی۔ پس وہ چلے گئے اور میں ہار تلاش کر کے واپس آئی تو کسی کو نہ پایا اور اس خیال سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی کہ جب مجھے ہودہ میں نہ پائیں گے تو واپس آئیں گے۔ اتنے میں میری آنکھ لگ گئی اور صفوان بن معطل لشکر کے پیچھے پیچھے رہا کرتا تھا تاکہ کوئی چیز رہ جائے یا گر جائے تو اسے اٹھا لیا کرے۔ وہ اس مقام پر پہنچا تو ایک انسان کی شکل دیکھ کر میرے پاس آیا اور مجھے پہچان لیا کیونکہ حجاب سے پہلے وہ مجھے دیکھا کرتا تھا۔ تب اس نے بلند آواز سے انا للہ پڑھا اور میں جاگ اٹھی۔ تب اس نے اپنی اونٹنی بٹھا دی اور میں چڑھ گئی۔ تو اس کی مہار پکڑ کر چل پڑا۔ یہاں تک کہ دوپہر کے وقت ہم لشکر میں مل گئے۔ اسی بنا پر بعض لوگوں نے طوفان اٹھایا اور سب سے بڑا حصہ اس میں عبداللہ بن اُبی بن سلول نے لیا۔ ادھر میں مدینہ پہنچ کر بیمار ہو گئی اور ایک ماہ تک بیمار رہی۔ مگر مجھے کوئی علم نہ تھا۔ یہاں تک کہ مسطح کی ماں سے میں نے یہ قصہ سنا، تب اس کی تصدیق کے لیے رسول اللہ ﷺ سے اجازت چاہی کہ والدین کے گھر چلی جاؤں۔ ادھر آنحضرت ﷺ نے سیدنا اسامہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما سے مشورہ کیا تو سیدنا اسامہ نے کہا ہم نے سوائے بھلائی کی کوئی بات کبھی نہیں دیکھی۔ اور سیدنا علی نے بریرہ (لونڈی) سے دریافت کرنے کو کہا، جس نے کہا کہ سوائے اس کے میں نے عیب کی بات نہیں دیکھی کہ وہ ایک کم سن لڑکی ہیں اور کبھی آٹا گندھا ہوا چھوڑ کر سو جاتی ہیں تو بکری کھا جاتی ہے۔ ادھر مجھے دو راتیں اور ایک دن روتے گزر گئے، تب رسول اللہ ﷺ آئے اور مجھ سے دریافت کیا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر میں اپنی بریت کا اظہار کروں تو کون مانے گا اور اگر میں جھوٹ اقرار کر لوں تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ سچ نہیں۔ پس سوائے اس کے کچھ نہیں کہتی جو حضرت یعقوب نے کہا تھا ﴿فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ﴾۔ پھر آپ پر یہ وحی نازل ہوئی اور میری بریت ہوئی۔ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ سے روایت ہے کہ جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے طوفان کی خبر سنی تو غش کھا کر گر گئیں۔

اس واقعہ پر عیسائی مصنفین نے بھی کچھ بیہودہ گوئی کی ہے۔ حالانکہ جانتے ہیں کہ اگر سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر ایسا الزام لگا تو مریم صدیقہ پر بھی تو لگا تھا۔ اور یہاں تو ادنیٰ سے ادنیٰ وجہ بھی شک کی نہیں۔ بلکہ صرف منافقوں کی شرارت تھی جو ہمیشہ اسلام کو نقصان پہنچانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔

2309- اس واقعہ کو خیر اس لیے کہا کہ نتیجہ میں بھلائی تھی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ان کو آئندہ ایسی باتوں میں

لَوْ لَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا ۙ وَّ قَالُوْا هٰذَاۤ اِفْكٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۲﴾

جب تم نے اسے سنا تھا تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے لوگوں پر نیک ظن کیوں نہ کیا اور (کیوں نہ) کہا کہ یہ صریح جھوٹ ہے۔ (2310)

لَوْ لَا جَآءُوْ عَلَیْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓىِٕكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾

کیوں نہ اس پر چار گواہ لائے، پس جب گواہ نہیں لائے، تو اللہ کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں۔ (2311)

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِیْ مَاۤ اَفَضْتُمْ فِیْهِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۴﴾

اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر دنیا اور آخرت میں نہ ہوتی تو جس بات کا تم نے چرچا کیا تھا، اس کی وجہ سے تمہیں بھاری عذاب پہنچا ہوتا۔

شمولیت سے روک دیا۔ اصل تشہیر کرنے والا گروہ تو منافقین ہی تھا۔ چار شخصوں کا نام اس واقعہ میں بالخصوص لیا گیا ہے یعنی عبداللہ بن اُبی، حمنہ جو ام المؤمنین زینب رضی اللہ عنہا بنت جحش کی بہن تھیں، مسطح جو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عزیزوں میں سے تھے اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان پر قذف کی حد لگائی گئی یا نہیں۔ اور ﴿وَالَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ﴾ کا مصداق جیسا کہ بخاری سے ثابت ہے عبداللہ بن اُبی ہی ہے جس نے اپنے چیلوں کے ذریعہ سے اس جھوٹ کو پہلے خود بنایا پھر خوب شہرت دی۔ مگر بعض لوگوں نے غلطی سے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو سمجھ لیا ہے۔

2310- مومنوں کو آپس میں حسن ظن سے کام لینا چاہئے۔ اس لیے کہ وہ ایک دوسرے کے اندرونی حالات کا علم رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ایک مومن جو خدا کی رضا کو چاہنے والا ہے اس قسم کے شنیع فعل کا ارتکاب نہیں کرسکتا۔ اور پھر آٹھ یا دس گھنٹے کی علیحدگی میں بدوں کسی پہلے تعلق کے جو ممکن طور پر ہوتا اتنی بلند پایہ عورت سے جیسے صدیقہ تھیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مزکی انسان کی بی بی، سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے پاکباز کی بیٹی سے کس طرح ایسے گندے فعل کا ارتکاب ہوسکتا تھا جو ایک بدمعاش خبیث انسان کا کام تھا۔ پھر اس کا بنانے والا عبداللہ بن ابی جیسا دشمن اسلام۔ ادنیٰ تامل بھی بتا سکتا تھا کہ یہ ایک بہتان ہے، اور یہ کہنا کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شک ہوگیا تھا یہ بھی آپ پر بہتان ہے۔ آپ نے نزول آیت سے پہلے وعظ فرمایا کہ میں اپنے اہل کی نسبت بھلائی کا ہی علم رکھتا ہوں۔

2311- ایسے معاملہ کی تشہیر کرنا جس پر ایک بھی شہادت نہیں کاذب کے سوائے اور کس کا کام ہوسکتا ہے۔ اور اللہ کا حکم یہی ہے کہ ایسے آدمی کو کاذب سمجھا جائے جو بغیر شہادت کے پاک دامن عورتوں پر تہمتیں لگاتا اور ان کی تشہیر کرتا ہے۔

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَ تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾

جب تم اپنی زبانوں سے اسے لیتے تھے اور اپنے مونہوں سے وہ بات کہتے تھے جس کا تمہیں کوئی علم نہ تھا اور تم اسے آسان سمجھتے تھے اور وہ اللہ کے نزدیک بری بھاری بات تھی۔ (2312)

وَ لَوْ لَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۶﴾

اور جب تم نے اسے سنا تو کیوں نہ کہا کہ ہمیں یہ مناسب نہیں کہ اس کے متعلق باتیں کریں۔ (اے اللہ) تیری ذات پاک ہے یہ تو بڑا بہتان ہے۔

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷﴾

اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ ایسی بات پھر کبھی (نہ) کرو، اگر تم مومن ہو۔

وَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۸﴾

اور اللہ تمہارے لیے آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾

جو لوگ چاہتے ہیں کہ بے حیائی (کی باتیں) ان لوگوں میں پھیلیں جو ایمان لائے ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (2313)

2312- ﴿تَلَقَّوْنَهٗ﴾ اصل میں تَتَلَقَّوْنَهٗ ہے [دیکھو نمبر: 57] بہت سے گناہ ہیں کہ انسان انہیں چھوٹے سمجھ کر ان کا ارتکاب کر لیتا ہے اور ان کے نتائج بہت بد ہوتے ہیں۔ بُری بات کو کبھی سہل نہ سمجھنا چاہئے۔

2313- حد جو ان پر لگائی جائے وہ دنیا کا عذاب الیم نہیں کہلا سکتی۔ بالخصوص جب کہ اس کے ساتھ ہی آخرت میں عذاب الیم کا ذکر ہو۔ بلکہ کینہ اور حسد وغیرہ مراد ہیں جو انسان کے دل میں آگ کی طرح بھڑکتے ہیں اور اس کے لیے دردناک دکھ کا موجب ہو جاتے ہیں۔ ایسے انسان کو راحت اور آرام میسر نہیں آتا۔ یا مراد یہ ہے کہ جو جھوٹے الزام دوسروں پر دیتے ہیں خود ان کا

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ وَ اَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾ ع

اور اگر اس کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی اور کہ اللہ مہربان رحم کرنے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَ مَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّ لٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، اور جو کوئی شیطان کے قدموں کی پیروی کرتا ہے تو (شیطان) بے حیائی اور برائی کے لیے ہی کہتا ہے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی، تو کوئی بھی تم میں سے کبھی پاک نہ ہوتا لیکن اللہ جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (2314)

وَ لَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِي الْقُرْبٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَ لْيَعْفُوْا وَ لْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾

اور تم میں سے بزرگی اور وسعت والے لوگ یہ قسم نہ کھائیں کہ وہ قریبیوں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہیں دیں گے، اور چاہئے کہ معاف کریں اور درگزر کریں۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہاری مغفرت کرے اور اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (2315)

شکار ہوتے ہیں۔ اگلی آیت میں لَوْلَا جواب وہی ہے جو آیت 21 میں مذکور ہے۔

2314- یہ رکوع پہلے دونوں رکوعوں کے لیے بطور تتمہ کے ہے۔ عرب ہر قسم کے افعال شنیعہ کے ارتکاب کی وجہ سے شیطان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مزکی بھیج کر کس طرح ان تمام ناپاکیوں سے اسے صاف کیا۔ تو جس راستباز انسان کی قوت قدسی سے سارا ملک پاک ہو گیا، کیا اس کا گھر اس کی قوت قدسی سے پاک نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے افک کے ذکر سے پہلے یہ لفظ آئے ہیں [دیکھو آیت: 10] اور اس ذکر کے خاتمہ پر بھی یہی لفظ آئے ہیں۔ [دیکھو آیت: 20]

2315- ﴿يَاْتَلِ﴾۔ اَلْوَتٌ کے معنی ہیں ایک بات میں کمی کی اور اَلْيَتٌ کے معنی ہیں قسم کھائی اور يَاْتَلِ اَلْوَتٌ یا اَلْيَتٌ سے باب افتعال ہے۔ (غ)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۪ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾

جولوگ پاک دامن بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔(2316)

يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾

جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے خلاف اس کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔

يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿۲۵﴾

اس دن اللہ انہیں ان کا ٹھیک بدلہ پورا پورا دے گا اور جان لیں گے کہ اللہ ہی حق (اور) کھولنے والا ہے۔(2317)

مسطح جو تشہیر افک میں ملوث ہوا سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خالہ یا ہمشیرہ کا بیٹا تھا۔ بدر میں شامل تھا اور فقراء مہاجرین میں سے تھا اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کی امداد کیا کرتے تھے۔ قصہ افک میں ملوث ہونے کی وجہ سے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کی امداد بند کر دی، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فضل والا یعنی بلحاظ دین بزرگی والا اور وسعت والا یعنی مال دنیوی کے لحاظ سے فراخ دست فرمایا ہے، اور یہ حکم دیا کہ امداد سے ہاتھ نہ روکو۔ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے امداد جاری رکھی۔ کس قدر فراخ دلی کی یہ تعلیم ہے کہ دنیا میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بی اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی اس پر اتنا بڑا اتہام باندھا جاتا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی یہ وحی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے لیے نازل ہوتی ہے کہ بہتان باندھنے والوں کی امداد سے ہاتھ نہ روکو۔ کس قدر بڑے دل کا انسان یہ رسول ہے جس کی بیوی پر بہتان باندھا جاتا ہے اور اس پر وحی نازل ہوتی ہے کہ بہتان باندھنے والوں کی امداد سے کنارہ کشی نہ کی جائے۔ اور کس قدر وسعت قلب اس کے شاگرد کا ہے کہ بیٹی پر بہتان باندھنے والے کی امداد بھی کرتا ہے۔ آج کسی شخص کے متعلق ادنیٰ سی بات کسی کے منہ سے نکل جائے تو عمر بھر کینہ کو نہیں چھوڑتا۔ کیا اس وسعت قلبی کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ میں نظر آتی ہے دنیا کوئی اور نظیر بھی پیش کر سکتی ہے۔

2316- غٰفِلٰتِ۔ غَفْلَةٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 1516ب] ایک چیز کا احساس نہ ہونے پر بھی بولا جاتا ہے اور یہاں مراد ایسی پاک دامن عورتیں ہیں جن کے دل میں بدی کا وہم بھی نہیں گزرتا۔ اس لیے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی کمال بریت کا بھی اظہار فرمایا ہے کہ وہ ایسی پاک تھیں کہ ان کے دل میں بدی کا وہم بھی نہیں گزرا۔

2317- ﴿اَلْمُبِيْنُ﴾۔ اَبَانَ لازمی سے ہو تو معنی ہوں گے اَلظَّاهِرُ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اگر اَبَانَ متعدی سے ہو جس کے معنی ہیں ایک بات کو واضح کر کے بیان کیا تو مراد ہوگی حق کو واضح کر کے بیان کرنے والا۔ اور اَلْحَقُّ اور اَلْمُبِيْنُ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَ الطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَ الطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۶﴾ ع

پلید چیزیں پلید لوگوں کے لیے اور پلید لوگ پلید چیزوں کے لیے ہیں۔ اور اچھی چیزیں اچھے لوگوں کے لیے ہیں اور اچھے لوگ اچھی چیزوں کے لیے ہیں۔ یہ لوگ ان باتوں سے بری ہیں جو وہ کہتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور عزت والا رزق ہے۔ (2318)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوائے (دوسرے) گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو اور ان کے رہنے والوں پر سلام نہ کرلو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرلو۔ (2319)

2318- خَبِيْثٰتُ اور طَيِّبٰتُ سے مراد برے اور اچھے اقوال یا اعمال ہیں۔ (غ) مطلب یہ ہے کہ ناپاک منافقوں کے لیے ایسی ہی ناپاک باتیں رہ گئی ہیں، نہ ان کے دل میں پاک خیالات آتے ہیں نہ وہ دوسروں کی طرف انہیں منسوب کرتے ہیں۔ اور اُولٰٓئِكَ میں اشارہ ان پاک لوگوں کی طرف ہے جن پر اتہام باندھا گیا، خصوصاً اہل بیت نبوی۔

2319- ﴿تَسْتَاْنِسُوْا﴾۔ اٰنَسَ کے لیے [دیکھو نمبر: 609] اور اِنْسٌ کو اِنْسٌ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ دیکھے جاتے ہیں۔ برخلاف جنّ کے کہ وہ نہیں دیکھے جاتے۔ اور تَسْتَاْنِسُوْا کے معنی تَسْتَاْذِنُوْا ہیں یعنی اذن لے لو۔ اور یوں بھی معنی کیے گئے ہیں [تَعْلَمُوْا أَيُرِيْدُ أَهلُها أَنْ تَدْخُلُوْا أَمْ لَا] یعنی جان لو کہ گھر والے تمہارا اندر آنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ (ل) یا [تَجِدُوْا إِيْنَاسًا] یعنی علم پالو۔ (غ)

تہمت سے بچنے کا علاج:

اس رکوع میں وہ علاج بتائے ہیں جو مسلمانوں کو زنا اور تہمتیں لگانے سے بچا سکتے ہیں۔ انہی میں سے پہلی بات ہے کہ گھروں میں بغیر اجازت کے اور [اَلسَّلَامُ عَلَيْكُم] کہنے کے داخل نہ ہوں۔ کیونکہ ناگہاں دوسرے کے گھر میں داخل ہونے سے بدظنی کے موقعے بھی پیدا ہوتے ہیں اور بدی کے بھی۔ اور دوسرے انسان اپنے گھر میں ہر وقت ایسی حالت میں نہیں ہوتا کہ وہ پسند کرتا ہو کہ دوسرا اسے اس حالت میں دیکھے۔ علیحدگی یا خلوت ہر انسان کا حق ہے جس میں کوئی دوسرا دخل دینے کا مجاز نہیں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اب یہ اصول اجازت حاصل کرنے کا بالکل ترک کر دیا ہے اور یورپ نے اس اصول کو لے لیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو بہت سے اسلامی تعلیم کے اصول سے مسلمان دور پڑے ہوئے ہیں اور دوسری قومیں ان

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸﴾

پھر اگر ان میں کسی کو نہ پاؤ تو اس میں داخل نہ ہو جب تک کہ تمہیں اجازت نہ دی جائے اور اگر تمہیں کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ جاؤ۔ وہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اور جو تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے۔ (2320)

پر عامل ہیں۔ اسلام کے ذریعہ سے جو فائدہ مسلمانوں کو پہنچ سکتا ہے وہ تو اس کے اصول پر عمل پیرا ہونے سے پہنچ سکتا ہے نہ برائے نام مسلمان کہلانے سے۔ پس اگر اصول اسلامی کو مسلمان چھوڑ دیں اور دوسری قومیں ان پر عامل ہوں تو فوائد اسلامی سے بھی مسلمان محروم ہوں گے اور دوسری قومیں ان سے بہرہ ور ہوں گی۔

دوسرے کے گھر جانے کے آداب:

اجازت کے متعلق جو آداب نبی کریم ﷺ سے مروی ہیں وہ یہ ہیں کہ تین دفعہ اجازت طلب کرے۔ ایک دفعہ آپ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے گھر گئے تو آپ نے [اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ] کہا، سعد نے اتنا آہستہ جواب دیا کہ آپ نے نہ سنا۔ اسی طرح دوسری اور تیسری دفعہ ہوا تو آپ واپس چلے گئے۔ تو سعد آپ کے پیچھے نکلے اور عرض کیا یا رسول اللہ میں نے عمداً آہستہ جواب دیا تھا، تاکہ آپ بار بار [اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ] کہیں (کیونکہ سلام بھی دعا ہے)، تو آپ واپس آئے اور ان کے لیے بہت دعا کی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کا عشق آپ سے کس قسم کا تھا۔ محبت بھی کمال درجہ کی ہے اور اس میں سادگی بھی کمال درجہ کی۔ اور تین دفعہ آواز دینے کا مطلب صرف یہ ہے کہ گھر والوں کو اطلاع مل جائے، ایسا نہ ہو کہ ایک آواز دی اور وہ آواز کسی نے سنی نہیں تو یوں ہی واپس ہو جائے۔ اور یہ غرض اس طرح بھی پوری ہو سکتی ہے کہ بذریعہ تحریر کے یا ملاقاتی کارڈ کے اطلاع دے دی جائے یا گھر آنے سے پیشتر وقت ملاقات مقرر کر لیا جائے۔ تاہم بلند آواز سے طلب اجازت دل کو بھی پاک رکھنے والی چیز ہے اور مظنات بھی اس سے دور ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ دروازے کے عین سامنے کھڑے نہ ہوتے تھے، بلکہ ایک طرف ہٹ کر تاکہ اندر نظر نہ پڑے۔ اور حدیث میں ہے کہ جو شخص بغیر اطلاع کے دوسرے کے جھانکے تو اس کو کنکر مارنے میں بھی حرج نہیں۔ ایسا ہی اجازت لینے میں نام بتانا چاہئے۔ اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اپنی ماؤں اور بہنوں کے گھروں میں جاؤ تو بھی اجازت لے کر جاؤ۔

2320- کس قدر پاکیزہ اور سادگی کی تعلیم ہے۔ آج اول تو مسلمانوں میں باہم تعلقات محبت کی جگہ بغض زیادہ پھیلا ہوا ہے۔ پھر اگر کوئی کسی کی ملاقات کو جائے اور وہ اس وقت کسی مصروفیت کی وجہ سے نہ مل سکے تو یہ ہمیشہ کے تعلقات منقطع ہونے کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔ بعض مہاجرین کا قول نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی ساری عمر اس بات کو چاہا کہ وہ کسی سے ملنے جائیں تو انہیں کہا جائے واپس ہو جاؤ تاکہ اس حکم الٰہی کی بھی تعمیل ہو، اور ایسا موقعہ نہیں ملا۔ یہ روح احکام قرآنی کی تعمیل کی ہم میں پیدا

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾

تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم غیر آباد گھروں میں داخل ہو جاؤ جن میں تمہارا اسباب ہو، اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿۳۰﴾

مومنوں کو کہہ دو وہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔ اللہ اس سے خبردار ہے جو وہ کرتے ہیں۔ (2321)

ہونی چاہئے۔

2321- ﴿يَغُضُّوْا﴾۔ غَضّ نظر اور آواز میں کمی ہے۔ ﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ﴾ [لقمان: 19:31] ''اور اپنی آواز کو نیچا رکھ۔'' (غ) اور [غَضَّ بَصَرُهُ] کے معنی ہیں اسے روکا اور نیچا کیا۔ اور حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ خوش ہوتے تھے تو آنکھ نیچی کر لیتے تھے۔ (ل)

زنا سے بچنے کا طریق:

قرآن کریم صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتا بلکہ ہر نیکی پر چلنے کی اور ہر بدی سے بچنے کی راہیں بتاتا ہے۔ اور بڑی سے بڑی بدیوں سے بچنے کی آسان سے آسان راہیں بتائی ہیں۔ زنا کتنی بڑی بدی ہے مگر اس کی ابتدا کیسی چھوٹی ہے اور اگر وہاں سے اسے روکا جائے تو آسانی سے رک سکتا ہے۔ اس کی ابتدا بدنظری سے ہوتی ہے۔ لیکن صرف بدنظری سے بچنے کی ہدایت بھی نامکمل ہوتی۔ اس لیے فرمایا کہ مومن مرد (اور اگلی آیت میں یہی حکم مومن عورتوں کو ہے) نگاہیں نیچی رکھنے کی عادت ڈالیں۔ بدی کے موقعہ سے اپنے آپ کو بچانا یہ اسلام کی اس بارہ میں تعلیم کا عملی اصل الاصول ہے۔ جو شخص بدی کے موقعہ سے اپنے آپ کو بچاتا ہے اس میں بدی سے بچنے کی ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ پھر اگر بڑی بھاری ترغیب کا بھی موقعہ ہو تو وہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ زنا سے بچنے کے لیے اور اپنے اندر عفت کی قوت پیدا کرنے کے لیے یہ علاج بتایا کہ نظر نیچی رکھنے کی عادت ڈالی جائے۔ جب انسان عموماً اپنی نگاہ نیچی رکھے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شہوت کی نظر سے عورتوں کو دیکھنے سے بچ جائے گا اور یوں اس کے قوائے شہوانی اعتدال کی حالت میں آ جائیں گے۔ اور اگر کوئی ترغیب کا موقعہ بھی اس کے سامنے پیش آئے گا تو اس کے اندر پاکیزگی کی اس قدر قوت پیدا ہو چکی ہوگی کہ وہ اس ترغیب پر آسانی سے غالب آ سکے گا۔ بدی اور بالخصوص زنا سے بچنے کا یہ فلسفہ قرآن کریم سے مخصوص ہے۔ ﴿وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ﴾ سے یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہر وہ اس راہ کی حفاظت کریں جس سے شیطان حملہ آور ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ آنکھوں کا بھی زنا ہے اور کانوں کا

وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا

اور مومن عورتوں کو کہہ دے کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو (عادتاً) کھلا رہتا ہے،(2322)

بھی اور زبان کا بھی اور ہاتھوں کا بھی اور پاؤں کا بھی۔ اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ یہ نگاہوں کے نیچے رکھنے کا گویا نتیجہ ہے کہ وہ زنا سے اپنے آپ کو بچائیں۔ اور اسی غرض کے لیے نبی کریم ﷺ نے رستوں پر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ کیونکہ اس طرح بھی انسان خواہ مخواہ ایک بدی کے موقعہ پر اپنے آپ کو ڈالتا ہے اور اتفاقی طور پر کسی عورت پر نظر پڑ جانا قابل گرفت نہیں۔ لیکن اس کے بعد جو عمداً دیکھتا ہے وہ اس حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

2322- زِيْنَة حقیقی زینت وہی ہے جو انسان کے کسی حال میں عیب کا موجب نہ ہو، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ اور زینت تین طرح پر ہے۔ زینت نفس، جیسے علم اور اعتقادات حسنہ۔ زینت بدنی، جیسے قوت اور طول قامت اور زینت خارجی، جیسے مال اور جاہ۔ اور ﴿مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ﴾ [الأعراف: 32:7] ''کس نے اللہ کی زینت کو حرام کیا ہے؟'' میں زینت خارجی بھی مراد لی گئی ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ بزرگی ہے جس کا ذکر ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ [الحجرات:13:49] ''اللہ کے نزدیک عزت والا وہ ہے جو تقویٰ کرتا ہے۔'' میں ہے۔ (غ)

عورتوں کے باہر نکلنے کی ضرورت:

اس آیت کے پہلے حصہ میں وہی حکم عورتوں کو دیا ہے جو پہلی آیت میں مردوں کو دیا تھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ جس طرح مردوں کو باہر نکلنے کے مواقع پیش آتے ہیں اور انہیں غض بصر کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح عورتوں کو بھی باہر نکلنے کے موقعے ہیں اور وہ باہر نکل سکتی ہیں۔ پس ان الفاظ سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جس طرح عورتوں کی نظر مردوں پر پڑتی ہے جس کے لیے حکم ﴿يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ﴾ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اسی طرح مردوں کی نظر عورتوں پر پڑسکتی ہے جس کے لیے حکم ﴿يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾ کی ضرورت پیش آئی۔ پس دوسری بات جو ان الفاظ سے ثابت ہوتی ہے یہ ہے کہ عورتوں کے لیے کوئی ایسی اوڑھنی تجویز کرنا جس سے ان کو نظر کچھ نہ آئے اور سامنے آنے والوں پر ان کی نظر نہ پڑ سکے، قرآن شریف کا منشا نہیں۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کا کوئی ایسا حصہ کھلا بھی رہتا ہے جس کی وجہ سے مردوں کو نظریں نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور وہ حصہ وجہ ہے، جیسا کہ ابھی آگے آتا ہے۔

﴿مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ سے مراد:

دوسرے حصہ میں پہلا حکم یہ ہے کہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جو اس سے عادتاً ظاہر ہوتا ہے۔ ﴿مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کے یہی معنی ہیں کہ عام ضروریات انسانی کے لیے بعض مقامات کو کھلا رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے سوائے اور زینت کو ظاہر

نہ کریں۔ چنانچہ یہی معنی امام رازی نے قفال سے نقل کیے ہیں۔[إِلَّا مَا يَظْهَرُهُ الْإِنْسَانَ فِي الْعَادَةِ الْجَارِيَةِ]یعنی جسے انسان عادتاً ظاہر کرتا ہے اور یہی معنی روح المعانی میں لیے گئے ہیں [إِلَّا مَا جَرَتِ الْعَادَةِ وَالْجِبِلَّةِ عَلٰى ظُهُوْرِهِ]یعنی جو عادت کے طور پر اور طبعی طور پر کھلا رہنا چاہئے۔ اور یہی قول کشاف میں ہے۔

ضروریاتِ انسانی کا اقتضا:

اب ہم اگر بغیر اس بات کی طرف رجوع کرنے کے کہ سلف نے ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ سے کیا مراد لیا ہے واقعات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں جو حصہ عادتاً سب انساوں کو کھلا رکھنا پڑتا ہے وہ منہ اور ہاتھ ہیں، عام حالت انسانی میں اس کے بغیر چارہ نہیں۔ چند آسودہ حال لوگوں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو کیا مسلمانوں میں اور کیا غیر مسلموں میں بڑی بھاری کثرت انہی لوگوں کی نہیں ہے جن میں مردوں اور عورتوں دونوں کو اشغال زندگی میں جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور شاید بمشکل پانچ فیصدی لوگ ایسے ہوں گے جو عورتوں کے معاش کے کاروبار میں حصہ لیے بغیر گزارہ کر سکتے ہوں اور بغیر منہ اور ہاتھ کھلے رکھنے کے یہ کام قطعاً نہیں ہوسکتا۔ پس قرآن کریم کا منشا یہی ہے کہ عام ضروریات انسانی کے مطابق جن حصوں کو عادتاً کھلا چھوڑا جاتا ہے ان کے علاوہ عورتیں دیگر مقامات زینت کو ڈھانک لیا کریں۔

اقوال مفسرین کہ عورتوں کے باہر نکلنے میں منہ اور ہاتھ کھلے رہ سکتے ہیں:

اب اقوال مفسرین کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اقوال سلف کے بارہ میں ابن جریر کا مرتبہ سب سے بڑھ کر ہے۔ اور اس میں حسب ذیل اقوال ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کے متعلق ہیں۔ اول کہ اس سے مراد ظاہری لباس کی زینت ہے اور اس کی تائید میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ، عبداللہ اور ابراہیم کے اقوال ہیں۔ دوم کہ اس سے مراد وہ زینت ہے جس کا ظاہر کرنا عورت کے لیے جائز ہے۔ یعنی سرمہ اور انگوٹھی اور کڑے اور منہ۔ اور اس کی تائید میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، سعید بن جبیر، ضحاک، عطا، قتادہ، مسور بن مخرمہ، مجاہد، عامر، ابن زید، اوزاعی کے اقوال ہیں۔ سوم کہ اس سے مراد منہ اور کپڑے ہیں۔ اور اس کی تائید میں حسن کا قول ہے اور ان تینوں قسم کے اقوال کو نقل کر کے ابن جریر لکھتے ہیں کہ ان اقوال میں صحیح تر قول یہ ہے کہ اس سے مراد منہ اور ہاتھ ہیں۔ اور اس میں سرمہ اور انگوٹھی اور کڑے اور خضاب داخل ہیں۔ اور ہم اس کو صحیح تر قول اس لیے قرار دیتے ہیں کہ اس بات پر سب کا اجماع ہے کہ ہر نماز پڑھنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ نماز میں اپنی عورت یعنی چھپانے کی جگہ کو ڈھانکے۔ اور عورت کے لیے یہ ضروری ہے کہ نماز میں اپنا منہ اور ہاتھ کھلے رکھے اور اس کے سوائے اپنے سارے بدن کو چھپائے رکھے سوائے اس کے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے اجازت دی کہ عورت اپنا نصف ذراع (یعنی آدھی کلائی) کھلا رکھ سکتی ہے۔ پس جب اس پر اجماع ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے بدن کے اس حصہ کو کھلا رکھ سکتی ہے جو عورت میں داخل نہیں۔ کیونکہ جو عورت نہیں اس کا ظاہر کرنا بھی حرام نہیں۔ اور جب وہ اسے ظاہر کر سکتی ہے تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے قول ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ سے بھی یہی مراد ہے۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو اس سے ظاہر رہتی ہے۔ (ج)

اور روح المعانی میں ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کی تفسیر میں ہے یعنی سوائے اس کے جو عادتاً اور طبعاً کھلا رکھا جاتا ہے اور اس کی اصل

حالت یہی ہے کہ وہ کھلا رہے۔ جیسے انگوٹھی اور سرمہ اور خضاب۔ پس ان کے اجنبیوں کے سامنے ظاہر کرنے پر کوئی گرفت نہیں، اور اگر گرفت اس زینت کے ظاہر کرنے پر ہے جو چھپانی چاہئے جیسے کڑے اور جھانجر اور بازو بند اور گلوبند اور ہار اور بالیاں، اور ذکر زینت کا کیا اور ان مقامات کا ذکر نہیں کیا۔ تاکہ چھپانے کے حکم میں مبالغہ کا اظہار کیا جائے۔ کیونکہ یہ زینت ایسے مقامات پر ہے جن مقامات کی طرف دیکھنا جائز نہیں، سوائے ان کے جن کا بعد میں استثنا کیا گیا ہے اور وہ کلائی، پنڈلی اور بازو اور گردن اور سر اور سینہ اور کان ہیں۔ اور آگے چل کر لکھا ہے کہ وہ جو زمخشری نے لکھا ہے وہ امام ابوحنیفہ کے مشہور مذہب پر مبنی ہے۔ یعنی کہ ظاہر یعنی کھلی رہنے والی زینت کے موقعہ منہ اور دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں مطلقاً عورت یعنی چھپانے والے مقامات میں شامل نہیں۔ پس ان کی طرف دیکھنا بھی حرام نہیں۔

حدیث نبوی کہ منہ اور ہاتھ کھلے رہ سکتے ہیں:

اور اس کے بعد ابوداؤد اور ابن مردویہ اور بیہقی کی حدیث ذیل کو نقل کیا ہے جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: [أَنَّ أَسْمَاءَ بِنْتَ أَبِي بَكْرٍ دَخَلَتْ عَلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ وَعَلَيْهَا ثِيَابٌ رِقَاقٌ فَأَعْرَضَ عَنْهَا رَسُولُ الله ﷺ وَقَالَ يَا أَسْمَاءُ إِنَّ الْمَرْأَةَ إِذَا بَلَغَتْ الْمَحِيضَ لَمْ تَصْلُحْ أَنْ يُرَى مِنْهَا إِلَّا هَذَا وَهَذَا وَأَشَارَ إِلَى وَجْهِهِ وَكَفَّيْهِ] (سنن أبي داؤد، كتاب اللباس، باب فِيمَا تُبْدِي الْمَرْأَةُ مِنْ زِينَتِهَ ، حديث: 4106) یعنی اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کے پاس آئیں اور انہوں نے بہت باریک کپڑے پہنے ہوئے تھے، تو نبی ﷺ نے اس سے منہ پھیر لیا اور فرمایا: ''اے اسماء جب عورت حیض کی عمر کو پہنچ جائے تو پھر مناسب نہیں کہ اس کے بدن کا کوئی حصہ سوائے اس کے نظر آئے، اور آپ نے اپنے منہ اور ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔'' نبی ﷺ کی یہ حدیث اس بحث میں فیصلہ کن ہے اور اتنی دوسری تائیدات کے ساتھ یہ حدیث قطعی فیصلہ کر دیتی ہے کہ ﴿اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ میں جو حصہ مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ منہ اور ہاتھ ہیں۔

یہاں اس حدیث کو بھی لانا ضروری ہے جس سے بعض وقت ایک غلط استدلال بھی کیا گیا ہے یعنی ابن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہما کا واقعہ جو نابینا تھے کہ وہ نبی ﷺ پر داخل ہوئے درآنحالیکہ آپ کے پاس سیدہ ام سلمہ اور سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہما تھیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے حجاب کر لو۔ تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ یہ نابینا ہیں ہمیں نہیں دیکھتے اور نہ پہچانتے ہیں تو آپ نے فرمایا کیا تم دونوں نابینا ہو اور اسے نہیں دیکھتی ہو۔ اس حدیث سے یہ تو قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ عورت کے لیے کون سا حصہ ظاہر کرنا جائز ہے اور کون سا ظاہر کرنا جائز نہیں۔ ہاں اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ عورت کے لیے اجنبی مرد کو دیکھنا خواہ بہ نظر شہوت نہ بھی ہو جائز نہیں۔ چنانچہ ابن کثیر نے یہی استدلال کر کے اس کے مقابل پر صحیح بخاری کی حدیث کو پیش کیا ہے کہ عورت کا مرد کو بلا نظر شہوت دیکھنا جائز ہے۔ کیونکہ صحیح بخاری میں ہے کہ عید کے دن حبشی مسجد میں اپنے ہتھیاروں کا کھیل دکھا رہے تھے تو سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے پیچھے کھڑی ہو کر انہیں دیکھ رہی تھیں۔ اگر ان دونوں حدیثوں میں تعارض مانا جائے تو صحیح بخاری کی حدیث کو ترجیح ہے۔ لیکن اگر ہم حدیث اول کی یہ توجیہ کر لیں کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے لباس میں اس وقت کچھ نقص تھا جس کی طرف نبی ﷺ نے دونوں بیبیوں کو توجہ دلائی کہ تم نابینا نہیں ہو اور اسے دیکھ رہی ہو کہ کس حال میں ہے، تو

وَ لْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُیُوْبِهِنَّ ۪ وَ لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ

اور چاہئے کہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیں[2323] اور اپنی زینت کو (اور کسی کے سامنے) ظاہر

تعارض باقی نہیں رہتا۔ البتہ یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ عورت کا اپنا منہ کھلا رکھنا امر دیگر ہے اور دوسرے لوگوں کا اسے دیکھنا امر دیگر، اور یہیں سے بعض وقت غلطی لگتی ہے۔ جس طرح مردوں کو حکم ہے کہ عورتوں کو نہ دیکھیں یعنی نظریں نیچی رکھیں، اسی طرح عورتوں کو حکم ہے کہ مردوں کو نہ دیکھیں۔ لیکن ان دونوں حکموں میں سے نہ پہلے حکم سے یہ لازم آتا ہے کہ عورت کا منہ کھلا نہ ہو اور نہ حکم ثانی سے یہ لازم آتا ہے کہ مرد کا منہ کھلا نہ ہو۔ بلکہ ان حکموں کا دینا ہی بتاتا ہے کہ کوئی چیز ہے جو دیکھی جاسکتی ہے اور اسے دیکھنے سے روکا ہے۔ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا دیکھنا ایک ضرورت کے لیے تھا یعنی ان کی کھیل دیکھنے کے لیے تھا، اور حکم یہی ہے کہ اگر مرد کے سامنے عورت آجائے تو مرد کی آنکھیں نیچی ہو جانی چاہئیں، عورت کے سامنے مرد آجائے تو عورت کی آنکھیں نیچی ہو جانی چاہئیں۔ اور یہی بعض اجلہ پیروان امام شافعی نے لکھا ہے۔ یعنی عورت کے لیے منہ اور ہاتھ کھلے رکھنے جائز ہیں۔ لیکن اجنبیوں کا انہیں دیکھنا جائز نہیں اور اسے بعید قرار دینا جیسا کہ روح المعانی میں ہے تعجب ہے۔ کیونکہ یہ ایک نہایت کھلی بات ہے اور یہ دو الگ الگ فعل ہیں۔ منہ اور ہاتھ کھلے رکھنا، یہ عورت کا فعل ہے جو جائز ہے۔ دوسرے لوگوں کا اسے بلاضرورت دیکھنا یہ مردوں کا فعل ہے جو ناجائز ہے۔ اور بعض شافعیہ کا مذہب ہے کہ عورت کے منہ اور ہاتھ کا دیکھنا بھی جائز ہے اور حق بات یہ ہے کہ پہلی نظر تو پڑ جاتی ہے اور یہ انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ لیکن عمداً پھر دیکھتے رہنا ناجائز ہے۔ جیسا کہ پہلے نوٹ میں بیان ہو چکا۔

2323- خُمُرٍ۔ خِمار کی جمع ہے اور خمار وہ ہے جس کے ساتھ عورت اپنے سر کو ڈھانکتی ہے۔ (غ) یعنی اوڑھنی کیونکر خُمُرٍ کے معنی ڈھانکنا ہیں۔

جُیُوْب۔ جَیب کی جمع ہے، قمیص کا گریبان۔ اور [نَاصِحَ الْجَیْبَ] میں جیب سے مراد قلب اور سینہ ہے۔ (ل)

عرب کی عورتوں کا اظہار محاسن کرنا اور اسلام کا اس سے روکنا:

بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ اگر منہ کھلا رہا تو پھر پردہ بے معنی ہے۔ اس مشکل کو الفاظ ﴿وَ لْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُیُوْبِهِنَّ﴾ صاف کرتے ہیں۔ عرب میں بعینہٖ وہی دستور تھا جو آج یورپین عورتوں میں ہے کہ وہ گردن اور کندھے اور سینہ کا بعض حصہ اظہار حسن کے لیے کھلا چھوڑتی تھیں۔ تو اسلام نے ان مقامات کو عورت میں داخل کر دیا۔ یعنی چھپانے کے مقامات میں اور بعض وقت کرتوں کے گریبان اگر نیچے ہوں تو ان میں سے سینہ نظر آسکتا ہے۔ علاوہ ازیں عرب کی عورتیں بعینہٖ یورپ کی طرز پر چھاتیوں کو کپڑے وغیرہ کے ذریعہ سے ابھار کر رکھتی تھیں اور یوں اپنے ایسے محاسن کا اظہار کرتی تھیں جو مردوں میں تحریک شہوت پیدا کرتے ہیں اور جو بلاضرورت بھی ہیں۔ اس لیے جب اسلام نے سوائے ظاہر رہنے والے مقامات کے باقی مقامات کو چھپانے کا حکم دیا تو اس کی طرز بھی ساتھ ہی بتادی اور وہ یہ ہے کہ اپنی اوڑھنیاں گریبانوں پر ڈال لیں۔ اب اوڑھنی

اٰبَآىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَ لَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَ تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ

نہ کریں سوائے اپنے خاوندوں کے یا اپنے باپوں کے یا اپنے خاوند کے باپوں کے یا اپنے بیٹوں کے یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں کے یا اپنے بھائیوں کے یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے یا اپنی عورتوں کے یا ان کے جن کے ان کے داہنے ہاتھ مالک ہیں یا مردوں میں سے ایسے خادموں کے جو (عورتوں کی) حاجت نہیں رکھتے یا لڑکوں کے جو عورتوں کے پردے کی باتوں سے واقف نہیں۔ اور اپنے پاؤں کو (اس طرح) زمین پر نہ ماریں کہ ان کے چھپے ہوئے زیور معلوم ہو جائیں، اور اے مومنو سب کے سب اللہ کی طرف

اصل میں وہ چیز ہے جو سر کو ڈھانکتی ہے جیسا کہ تشریح لغوی سے ظاہر ہے۔ مگر اوڑھنی ایسے رنگ میں بھی اوڑھی جاسکتی ہے کہ سوائے سر کے باقی محاسن ظاہر رہیں۔ جیسا کہ بعض یورپین عورتیں ایک باریک دوپٹہ سر کے اوپر ڈال لیتی ہیں کہ کندھوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ اس لیے حکم دیا کہ اوڑھنی ایسی صورت میں اوڑھی جائے کہ گریبان کو ڈھانک لے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گردن اور سینہ اور کانوں کے محاسن سب پردہ کے نیچے آجائیں گے اور ایسا ہی کن پٹیاں، زلفیں اور وہ بال جو پیشانی کو زینت دیتے ہیں وہ سب ڈھک جائیں گے۔ عرب کی اسلام سے پہلے کی حالت وہی تھی جو آج یورپ کی حالت ہے اور عورتیں اپنے محاسن مردوں کو دکھانے پر فخر کرتی تھیں۔ اسلام نے اسی بات کو روکا ہے کہ عورت اپنے محاسن کی نمائش کر کے باہر نکلے اور لوگوں کے لیے موجب فتنہ ہو۔ کاروبار کی ضروریات کو نہیں روکا جن کے لیے منہ اور ہاتھ کھلے چھوڑنے پڑتے ہیں۔ ہاں باہر نکلتے وقت لباس، زیورات جسم کے محاسن کو حتی الوسع چھپالے، خواہ موٹی اوڑھنی سے یا برقعہ سے یا اوورکوٹ سے۔ جس سے سر، کانوں، گردن وغیرہ کے ڈھانکنے کا بھی انتظام ہو اور عورتوں کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگوں میں باہر نکلنا اس حکم کے بعد ثابت ہے۔ اور پانچ وقت نماز میں بھی مسجدوں میں آتی تھیں اور کھیتی وغیرہ کے کاروبار میں اپنے خاوندوں کے معاون بھی ہوتی تھیں۔ یہ ناممکن بات ہے کہ کوئی عورت اس پردہ کے ساتھ جو آج ہندوستان کے اچھے طبقہ میں مروج ہے جنگ میں باہر نکل سکے اور پھر زخمیوں کو پانی پلانے اور مرہم پٹی کا کام کر سکے۔ اور صحابہ کی جنگوں میں بھی عورتوں کا ساتھ نکلنا بلکہ بعض وقت دشمن کے مقابلہ میں تیار ہونا تاریخی واقعات ہیں۔

الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾ رجوع کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ (2324)

﴿مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ کا حکم مردوں کو گھروں میں آنے سے روکتا ہے نہ عورتوں کو باہر نکلنے سے:

اور یہ جو دوسری جگہ آتا ہے کہ اگر تم نے گھر کے اندر سے کوئی چیز مانگنی ہو تو ﴿مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ مانگو، یعنی پردہ کے پیچھے سے۔ تو گو یہ رسول اللہ ﷺ کی بیویوں کو حکم ہے مگر اس میں بھی مومن عورتیں شامل ہیں۔ اور اس میں عورتوں اور مردوں کے اس خلا ملا کو روکا ہے جو بہت بدنتائج کا موجب ہوتا ہے۔ عورت جب گھر سے باہر نکلے گی تو کافی احتیاط سے اپنے محاسن کو چھپا کر نکلے گی۔ لیکن گھر کے اندر ایسی احتیاط ہر وقت رکھنا مشکل ہے اور اس کے علاوہ بھی جو فتنے غیر مرد کے عورت کے پاس گھر کے اندر آنے سے پیدا ہو سکتے ہیں وہ عورت کے باہر نکلنے سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ پس اجنبی مردوں کو گھر کے اندر عورتوں کے پاس جانے سے روکا ہے۔ کیونکہ ایسے حالات میں ضرورت پس پردہ رہ کر بھی پوری ہو سکتی ہے۔ عورت کا اپنے کاروبار کے لیے گھر سے باہر نکلنا ان فتنوں کا موجب نہیں ہوتا جو مردوں کا غیر محرم عورتوں کے پاس تنہائی میں چلے جانا ہوتا ہے۔ اس پر مفصل بحث اپنی جگہ پر ہوگی۔

2324- تُّبِعِيْنَ۔ [أَتْبَاعَ الزَّوْجِ مِمَّن يَّخْدِمُهُ مِثْلَ الشَّيْخَ الْفَانِيْ وَالْعَجُوْزِ الْكَبِيْرَةِ] یعنی خدمت گار مراد ہیں۔

﴿اِرْبَةِ﴾۔ اَرب ایسی سخت حاجت کو کہتے ہیں جس کا اقتضاء یہ ہو کہ اسے دور کرنے کے لیے حیلہ کیا جائے۔ پس ہر اَرب حاجت ہے مگر ہر حاجت اَرب نہیں۔ اور [اَرِبٌ اِلٰی كَذَا] کے معنی ہیں اس کی سخت حاجت محسوس کی اور اِرْبَة اور مَأْرَبَة اس کے مصدر ہیں۔ ﴿وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى﴾ [طٰہٰ: 18:20] ''اور اس میں میرے لیے اور بھی فائدے ہیں۔'' اور ﴿اُولِي الْاِرْبَةِ﴾ سے مراد ہے نکاح کی حاجت والے۔

﴿لَمْ يَظْهَرُوْا﴾۔ [ظَهَرَ عَلَى الشَّيْءِ] کے معنی [اَطَّلَعَ عَلَيْهِ] بھی ہو سکتے ہیں، یعنی اس بات سے واقف ہوا اور [قَوِيَ عَلَيْهِ] بھی یعنی اس پر غالب ہوا۔ (ر)

﴿عَوْرٰتِ﴾۔ عَوْرَة شرمگاہ کو کہتے ہیں اور یہ کنایہ ہے اور اس کا اصل عار سے ہے گویا اس کے ظاہر کرنے میں انسان کو شرم آتی ہے۔ اور ﴿لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ﴾ سے مراد ہے کہ بلوغ کو نہیں پہنچے۔ اور عَوْرَة کے معنی شق ہیں جو کسی چیز میں ہو جیسے کپڑا یا گھر۔ ﴿اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ﴾ [الأحزاب: 13:33] ''ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں۔'' یعنی ان میں ایسے شگاف ہیں کہ جو کوئی ان میں آنا چاہتا ہے آ سکتا ہے۔ اور ﴿ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ﴾ [58] میں عَوْرَة سے مراد خَلَل ہے۔ (غ) یعنی پردہ کا وقت۔

کن مردوں کے سامنے عورت محاسن کا اظہار کر سکتی ہے:

اس حصہ میں بتایا ہے کہ وہ زینت جس کو عام طور پر ظاہر نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ لباس یا زیورات کی زینت ہو اور خواہ جسمانی خوبصورتی، جسے عورتیں ظاہر کرنے کی عادی ہیں، اس کا اظہار ایک تو چند رشتہ داروں پر ہو سکتا ہے۔ خاوند، باپ، خسر، خاوند کا بیٹا، بھائی، بھتیجا، بھانجا اور دودھ اور خون کے رشتے یکساں ہیں۔ چچا اور ماموں کا ذکر نہیں کیا اس لیے کہ وہ آباء کے حکم

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآىِٕكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾

اور جو تم میں سے مجرد ہیں ان کے نکاح کر دو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو صلاحیت رکھتے ہوں۔ اگر وہ محتاج ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا اور اللہ فراخی والا علم والا ہے۔(2325)

میں ہیں۔ اور آبٌ کا لفظ قرآن کریم میں چچا پر بولا گیا ہے۔ اس کے بعد ﴿نِسَآىِٕهِنَّ﴾ آتا ہے یعنی اپنی عورتیں۔ اس سے مراد اکثر نے مسلمان عورتیں لی ہیں۔ گویا غیر مذاہب کی عورتوں کے سامنے بھی اظہار محاسن نہیں چاہئے۔ مگر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مذاہب کی عورتیں نبی ﷺ کی بیبیوں کے پاس آتی جاتی تھیں۔ (د) اور اس لیے امام رازی کہتے ہیں سب عورتیں مراد ہیں۔ میرے نزدیک مطلب یہ ہے کہ اپنی طرز کی عورتیں ہوں یا جن سے تعلقات ہوں۔ کیونکہ بعض رذیل عورتیں یا ناواقف فتنہ کا موجب ہو جاتی ہیں۔ پھر ﴿مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ﴾ ہیں جن سے مراد بعض کے نزدیک لونڈیاں ہیں اور بعض کے نزدیک لونڈیاں اور غلام دونوں۔ اور یہ دوسرا خیال ہی درست ہے۔ اس لیے کہ لونڈیوں کے ذکر کی ضرورت بھی نہ تھی۔ پھر ایسے خادم مرد ہیں جو حاجت نکاح نہ رکھتے ہو۔ جیسے شیخ فانی وغیرہ اور پھر نابالغ لڑکے۔ ﴿مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ﴾ میں ایسے ادنیٰ درجہ کے لوگ آ سکتے ہیں جیسے خاکروب۔ لیکن ملازم کا خدمتگاروں کا ذکر تّٰبِعِيْنَ کے لفظ میں ہے۔ ہاں عورتوں کے اس احتیاط کے ساتھ جو باہر نکلنے کے متعلق ہے معمولی نوکروں سے کام لے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اور ایسا ہی دوسرے رشتہ دار اسی احتیاط کے ساتھ عورتوں کے سامنے آ سکتے ہیں جو ان کے باہر نکلنے کے متعلق ہے۔

پردہ میں افراط و تفریط:

اگر ایک طرف مسلمانوں نے افراط کر کے پردہ کو ایسا سخت بنایا ہوا ہے جو قرآن کریم کا منشا نہ تھا، تو دوسری طرف ایک بھی گھر نہیں جہاں سوائے ان لوگوں کے جن کا ذکر اس آیت میں ہے اور کوئی عزیز یا رشتہ دار سامنے نہ آتا ہو۔ گویا افراط کے ساتھ تفریط بھی موجود ہے۔ یہ اس لیے کہ قرآن شریف کی اصل تعلیم کو چھوڑ دیا اور اپنے خیالات کا تتبع مقصود ہے۔

2325- ﴿اَيَامٰى﴾۔ اَيِّم کی جمع ہے اور وہ وہ عورت ہے جس کا خاوند نہ ہو۔ اور اس مرد کو بھی کہہ دیا جاتا ہے جس کی بی بی نہ ہو۔ (غ)

مجردوں کے نکاح کا حکم:

اَيِّم کا لفظ ہر مجرد پر حاوی ہے، مرد ہو یا عورت۔ نکاح کر کے اپنے زوج کو کھو چکا ہو یا ابھی نکاح ہی نہ کیا ہو۔ گو خصوصیت سے رانڈ اور رنڈوے پر بولا جاتا ہے اور یہاں عام ہی ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ نکاح ضروری ہے اور مجردوں سے بدکاری پیدا ہوتی ہے۔ اور یہاں چونکہ ان اسباب کا ذکر کیا ہے جن سے بدکاری اور زنا کاری رکے۔ اس لیے یہ بھی بتا دیا کہ حتی الوسع نکاح ہونے چاہئیں۔ یہاں تک کہ غلاموں اور لونڈیوں کے بھی ہونے چاہئیں۔ جو لوگ بیوہ عورتوں کو نکاح سے روکتے ہیں وہ اس حکم قرآنی کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور نتیجہ اس کا بہت برا نکلتا ہے۔ یورپ کی زنا کاری کا علاج بھی اسی حکم کی تعلیم سے

وَ لْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اٰتٰىكُمْ ؕ وَ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ

اور جو شادی (کا سامان) نہیں پاتے اپنے تئیں بچائے رکھیں یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے[2326] اور جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں ان میں سے جو آزادی کی تحریر مانگیں تو انہیں لکھ دو، اگر تم ان میں بھلائی جانتے ہو۔ اور ان کو اللہ کے مال سے دو جو اس نے تمہیں دیا ہے۔[2327] اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاکدامن رہنا چاہتی ہیں بدکاری پر مجبور نہ کرو، تاکہ تم دنیا

ہوسکتا ہے۔ اور یہ لوگ اگر بدی کو بدی سمجھ کر اس اسلامی ہدایت کو قبول نہ کریں گے تو پیدائش کی کمی جو بدکاری کے بڑھ جانے کا لازمی نتیجہ ہے انہیں مجبور کر کے اس طرف لائے گی۔ ﴿اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ میں سمجھایا کہ نکاح کے ساتھ بعض کشائش کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اول تو عورت بہت سے کاروبار میں مرد کی معاون ہو جاتی ہے۔ دوسرے ذمہ داری کا احساس بھی مرد میں زیادہ ہمت پیدا کر دیتا ہے۔

2326- ﴿لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا﴾ سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ رشتہ نہ ملے اور یہ بھی کہ سامان نہ ہو۔ لیکن آج کل جو لوگوں نے رسم و رواج کے تتبع میں نکاح کے لیے سامان ضروری ٹھہرایا ہوا ہے وہ مراد نہیں۔ اور اِسْتِعْفَافِ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو بدکاری سے روکیں۔ یعنی شہوانی خیالات کے خلاف جدوجہد کریں۔ اور حدیث میں روزہ بھی اس کا علاج بتایا گیا ہے۔

2327- ﴿الْكِتٰبَ﴾۔ كِتَابَة سے بھی ہوسکتا ہے۔ جس کے معنی واجب کرنا ہیں۔ اور كَتْبٌ سے بھی جس کے معنی نظم ہیں۔ (غ) اور كِتَابَةٌ جس سے مراد غلام کو تحریر کا لکھ دینا ہے کہ وہ اس شرط پر آزاد ہے۔ اسلامی لفظ ہے، اہل جاہلیت اسے جانتے نہ تھے۔ (ر)

﴿خَيْرًا۔﴾ خَيْر کے معنی [نمبر: 137] اور [نمبر: 220] وغیرہ میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں بعض نے معنی مال بھی مراد لیے ہیں اور بعض نے معنی نفع لیے ہیں جو انہیں خود اور ان کے آزاد کرنے والوں کو ان کی آزادی سے پہنچے۔ (غ) اور صورت اول میں بھی مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ان کے پاس مال جمع ہو۔ بلکہ یہ معنی ہوں گے کہ وہ مال جمع کرنے یا کمانے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ اور چونکہ خیر کا لفظ اس مال پر عموماً بولا گیا ہے جو وجہ محمود سے کمایا جائے۔ جیسے وصیت کا حکم دیتے وقت فرمایا ﴿اِنْ تَرَكَ خَيْرَا﴾ [البقرة: 180:2] ''اگر وہ بہت سا مال چھوڑیں۔'' یا جیسے ﴿قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ﴾ [البقرة: 215:2] ''کہہ جو کچھ بھی اچھے مال سے خرچ کرو۔'' ﴿وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ﴾ [البقرة: 273:2] ''اور جو کچھ مال تم خرچ کرو۔'' اس لیے مطلب یہ ہوا کہ ان میں یہ قابلیت دیکھو کہ وہ وجہ محمود پر مال کما سکتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ مال کمانے کی اہلیت نہیں رکھتے تو پھر چوری کر کے یا

وَ مَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾

کی زندگی کا سامان چاہو اور جو کوئی انہیں مجبور کرے تو اللہ ان کے جبر کے بعد بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (2328)

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾ ع 4 8 10

اور ہم نے تمہاری طرف کھول کر بیان کرنے والی آیتیں اتاریں اور کچھ ان لوگوں کے حالات جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور متقیوں کے لیے نصیحت۔ (2329)

اور ناجائز طریق پر اپنا گزارہ کریں گے اور یوں دونوں صورتوں میں مطلب ایک ہے۔

نکاح کے ذکر میں غلاموں کی کتابت کا ذکر کیا۔ یعنی غلاموں کو آزاد کرنے کا منشا یہ ہے کہ وہ آزاد ہو کر نکاح کو زیادہ پسند کریں گے۔ اور یہاں مکاتبت کی شرط یہ رکھی ہے ﴿اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا﴾، اگر ان میں بھلائی کا علم ہو۔ یعنی یہ دیکھ لو کہ وہ آزاد ہو کر اپنے لیے بھی اور قوم کے لیے بھی مفید ہو سکتے ہیں۔ یہ اس لیے فرمایا کہ غلامی انسان کو بعض وقت نہایت ذلیل حالت تک پہنچا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بھلے برے کو بھی نہیں سوچ سکتا۔ اور پھر ان کو صرف تحریر دے دینے کا حکم ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے کچھ انہیں بھی دو۔ یعنی مالی طور پر بھی ان کی امداد کرو۔ اور یہ حکم سب مسلمانوں کو ہے۔ اسی بنا پر بیت المال سے بھی ان پر صرف کرنے کا حکم تھا اور زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف غلاموں کی آزادی ہے۔ قرآن کریم کے اس حکم سے بڑھ کر کس نے غلاموں کی آزادی کا کچھ کام کر کے دکھایا ہے۔

2328- بِغَآءِ فجور یعنی زنا ہے۔ کیونکہ یہ ایسی بات کی طرف تجاوز ہے جو نہیں چاہیئے۔ (غ)

لونڈیوں کو زنا پر مجبور کرنا:

مسلم اور ابوداؤد میں ہے کہ عبداللہ بن ابی کے پاس دو لونڈیاں تھیں جن سے وہ زنا کراتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور بعض روایات میں ہے کہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ لونڈیوں سے زنا کراتے اور اس کی اجرت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ تو اس ناپاک رسم کو مٹایا۔ بڑے بڑے معزز لوگوں کا اس طرح زنا کو علانیہ مروج کرنا بتاتا ہے کہ عرب میں زنا کاری کی حالت کہاں تک پہنچ گئی تھی۔ اور ﴿اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾ سے یہ مطلب نہیں کہ اگر وہ بچنا چاہیں تو انہیں مجبور نہ کرو اور اگر بچنا نہ چاہیں تو مجبور کرو۔ کیونکہ مجبور اسے ہی کہا جا سکتا ہے جو ایک کام کو نہ چاہے۔ اور ﴿اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾ محض صورت حال کا بیان ہے کہ وہ تو اس فعل قبیح سے بچنا چاہتی ہیں اور تم انہیں مجبور کرتے ہو۔ اور ﴿غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ ان کے لیے ہے جنہیں مجبور کیا گیا، حالانکہ وہ نہ چاہتی تھیں۔

2329- رکوع کی اس آخری آیت میں یہ بتا کر کہ یہ احکام جو انسان کے لیے روشنی کا کام دینے والے ہیں اللہ تعالیٰ نے ہی اتارے

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اللہ آسمانوں اور زمین کا روشن کرنے والا ہے۔(2330)

ہیں، اگلے رکوع کے مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔

2330- ﴿نُوْرُ﴾ وہ پھیلی ہوئی روشنی ہے جو دیکھنے میں مدد دیتی ہے، اور یہ دو قسم ہے۔ دنیوی اور اخروی۔ پھر دنیوی دو قسم ہے۔ ایک معاون بصیرت یعنی وہ روشنی جو امور الٰہیہ سے ہے جیسے نور عقل، نور قرآن، اور ایک معاون بصیرت جیسے سورج، چاند، ستاروں کی روشنی۔ ذیل کے مقامات پر الٰہی روشنی مراد ہے: ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ﴾[المآئدۃ: 15:5] ''تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کرنے والی کتاب آ چکی ہے۔'' ﴿وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ﴾[الأنعام: 122:6] ''اور اسے روشنی دی جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلے۔'' ﴿وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾[الشوریٰ: 52:42] ''لیکن ہم نے اسے نور بنایا، اس کے ساتھ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔'' ﴿فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾[الزمر: 22:39] ''اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک نور پر ہے۔'' ﴿نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾۔ اور محسوس یا معاون بصارت نور کی مثال ہے ﴿جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا﴾[یونس: 5:10] ''سورج کو چمکتا ہوا اور چاند کو روشن بنایا۔'' اور ضوء نور سے زیادہ خاص ہے۔ ﴿وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا﴾[الفرقان: 61:25] ''اور روشنی دینے والا چاند۔'' یعنی نور والا۔ اور بعض جگہ دونوں پر شامل ہے جیسے ﴿وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ﴾[الأنعام: 1:6] ''اور اندھیرا اور روشنی بنائے۔'' ﴿وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا﴾[الزمر: 69:39] ''اور زمین اپنے رب کے نور کے ساتھ چمک اٹھے گی۔'' اور نور اخروی جیسے ﴿يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ﴾[الحدید: 12:57] ''ان کا نور ان کے آگے دوڑ رہا ہوگا۔'' اور اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو نور کہا ہے۔ اس لیے کہ وہ مُنَوِّر ہے یعنی روشن کرنے والا۔ اور اللہ تعالیٰ کا اپنے آپ کو نور کہنا مبالغہ فعل کے لیے ہے۔ (غ) اور اللہ تعالیٰ کے اسماء میں جو نور ہے، تو ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس سے مراد ہے وہ جس کے نور کے ساتھ اندھے دیکھتے ہیں اور جس کی ہدایت کے ساتھ گمراہ ہدایت پاتے ہیں اور بعض نے اس کے معنی کیے ہیں ظاہر، جس کی وجہ سے ہر شے کا ظہور ہے۔ اور اسے جو اپنے نفس میں ظاہر ہو وہ دوسرے کو ظاہر کرنے والا نور کہا جاتا ہے۔ اور ابو منصور کا قول ہے کہ نور اللہ کی صفات میں سے ہے۔ اور ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ میں نور کے معنی [هَادِيْ اَهْلَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ] کیے گئے ہیں۔ یعنی آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں کو ہدایت دینے والا۔ (ل) اور بطور مبالغہ اللہ تعالیٰ کو جو مُنَوِّر ہے نور اسی طرح کہا جاتا ہے جیسے سخاوت میں مبالغہ کے لیے ایک شخص کو جُوْدٌ کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نور ہونے سے مراد:

پہلے چار رکوعوں میں وہ ہدایات دے کر جن سے انسان پاکیزگی حاصل کر سکتا ہے پچھلے رکوع کی آخری آیت میں فرمایا تھا کہ یہ کھول کر بیان کرنے والی یعنی روشنی دینے والی آیات اللہ تعالیٰ نے ہی اتاری ہیں۔ یہی مضمون اس رکوع کا ہے اور سب سے پہلے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب ہدایت کے لیے اس لیے اتاری کہ وہ ہی آسمانوں اور زمینوں میں روشنی پھیلانے والا ہے۔

مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّ لَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۳۵﴾

اس کے نور کی مثال (ایسی ہے) جیسے ایک طاق میں ایک چراغ ہے۔ چراغ ایک شیشہ میں ہے، شیشہ گویا کہ ایک چمکتا ہوا تارہ ہے (چراغ) ایک بابرکت زیتون کے درخت سے روشن ہو رہا ہے، جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔ قریب ہے کہ اس کا تیل روشنی دے، گو اسے آگ بھی نہ چھوئے، روشنی پر روشنی ہے اللہ اپنے نور کے لیے جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ (2331)

کیونکہ نور سے مراد منوّر رہی ہے۔ اور اگلے الفاظ ﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ﴾ خود بتاتے ہیں کہ یہاں مراد منور ہی ہے۔ اور ابن جریر نے نور کے معنی هَادِیْ کیے ہیں۔ اور یہ معنی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں اور گو یہاں بالخصوص ذکر ہدایت یعنی نور الٰہی کا ہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ دونوں طرح پر منور ہے۔ یعنی معاون بصارت، روشنی دینے والا بھی اور معاون بصیرت، روشنی دینے والا بھی۔ جیسا کہ ابن اثیر نے لکھا ہے۔ اور گو نور کے یہ معنی بھی درست ہیں کہ وہ فی نفسہٖ ظاہر دوسروں کو ظاہر کرنے والا ہے۔ مگر سیاق اسی کو چاہتا ہے کہ یہاں مراد ہادی ہی ہے۔ چنانچہ اگلی آیات میں اس کی ہدایت کا ذکر کھلے الفاظ میں ہے۔

2331- ﴿مِشْكٰوةٍ﴾۔ شَكْوٌ اور شِكَايَةٌ اور شَكْوٰى غم کا اظہار ہے ﴿اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ [یوسف: 86:12] ''میں اپنی پریشانی اور غم کی شکایت اللہ ہی سے کرتا ہوں۔'' ﴿وَ تَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ [المجادلة: 1:58] ''اور اللہ سے فریاد کرتی تھی۔'' اور شَكْوٌ اصل میں شَكْوَةٌ کا کھولنا اور جو کچھ اس میں ہے اس کا ظاہر کرنا ہے اور وہ چھوٹے سے مشکیزہ کو کہتے ہیں جس میں پانی رکھا جاتا ہے۔ اور مِشْكٰوةٍ اس سوراخ کو کہتے ہیں جو دوسری طرف نہ نکل گیا ہو یعنی طاق۔ اور یہ دل کی مثال ہے۔ اور چراغ سے مراد نور الٰہی ہے جو اس میں ہے۔ (غ) اور بعض نے مِشْكٰوةٍ سے مراد وہ لوہا بھی لیا ہے جس سے قندیل لٹکائی جاتی ہے۔ (ل)

﴿مِصْبَاحٌ﴾۔ صُبْح اور [صَبَاحَ اَوَّلُ النَّهَارَ] ہے یعنی دن کا پہلا حصہ۔ اور وہ وہ وقت ہے جب افق سورج کی روشنی سے چمک اٹھتا ہے۔ اور مِصْبَاحٌ چراغ کو بھی کہتے ہیں۔ جیسے یہاں اور ستارہ کو بھی ﴿وَ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ﴾ [حٰمٓ السجدة: 12:41] ''اور ہم نے ورلے آسمان کو ستاروں سے زینت دی۔'' (غ)

﴿زُجَاجَةٍ﴾ شفاف پتھر کو کہتے ہیں۔

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ یہ نوران گھروں میں ہے جو اللہ نے حکم دیا ہے کہ بلند کیے

﴿دُرِّیٌّ﴾۔ دَرّ دودھ اور آنسو کے بہنے پر بولا جاتا ہے اور دودھ کو بھی دَرّ کہتے ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ آپ نے [ذَوَاتِ الدَّرِّ] کے ذبح کرنے سے منع کیا، یعنی ان جانوروں کے ذبح سے جو دودھ دے رہے ہوں۔ اور دُرَّۃ بڑے موتی کو کہتے ہیں۔ اور دُرِّیٌّ۔ دُرّ کی طرف منسوب ہے، یعنی بہت چمکنے والا۔ (ل)

﴿زَیْتُوْنَةٍ﴾ اور [زَیْتُوْنَ شَجَرٍ] اور شَجَرَةٍ کی طرح ہے اور زَیْتٌ زیتون کا تیل ہے۔ (غ)

رسول اللہ ﷺ کے قلب صافی اور نور کا فطری نقشہ:

اللہ تعالیٰ جو منور اور ہادی ہے اس کے نور کی یہاں مثال بیان کی ہے اور اس کے نور سے مراد اس کی ہدایت یا اس کا رسول ہی ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کو بھی نور کہا ہے ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ﴾ [المآئدۃ: 15:5] ''تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کرنے والی کتاب آچکی ہے۔'' اور اگلے الفاظ میں جو مثال بیان کی ہے وہ اسلام یا اسلام کے لانے والے محمد رسول اللہ ﷺ کی مثال ہی ہے۔ اور اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کا ہونا کعب سے مروی ہے۔ (ج) اس نور کو پہلے مثال طاق سے دی ہے جس میں چراغ رکھا جاتا ہے اور اس سے اشارہ قلب رسول کی طرف ہے کہ وہ ایک طاق کی مثال ہے۔ پھر اس طاق یعنی قلب میں چراغ موجود ہے اور اس سے مراد فطری نور الٰہی ہے اور وہ فطری نور نہایت صاف ہے۔ کیونکہ وہ شیشہ میں ہے اور شیشہ یا قندیل میں جو چراغ ہو وہ دھواں نہیں دیتا۔ گویا آپ کا فطری نور ایسا ہے کہ اس میں ادنیٰ شائبہ ظلمت کا نہیں ہے اور وہ شیشہ ایسا نہیں کہ اس نور کو کم کردے۔ بلکہ ایک چمکتے ہوئے ستارہ کی طرح ہے۔ گویا وہ فطری نور مصفی ہے اور نہایت درجہ کا چمکدار بھی یعنی کمزور نور نہیں۔ بلکہ جہاں تک چمک نور میں آسکتی ہے وہ اس میں بھی موجود ہے۔ پھر اس چراغ میں جو تیل ہے جس سے وہ چراغ روشن ہے وہ ایک بابرکت درخت سے ہے، اور مبارک وہ ہے جس کی خیر منقطع نہ ہو۔ یعنی نور کبھی بجھے گا نہیں اور دائمی ہوگا۔ اور وہ زَیْتُوْنَ ہے اس لیے کہ زیتون کے تیل میں کمال درجہ کی صفائی ہوتی ہے۔ اور زیتون کا لفظ اختیار کرنے میں خاص اشارہ بھی ہے دیکھو ﴿وَ التِّیْنِ وَ الزَّیْتُوْنِ﴾ پر نوٹ۔ اور یہ جو فرمایا ﴿لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّ لَا غَرْبِیَّةٍ﴾ تو اس سے مراد ہے جیسا کہ زجاج نے کہا ہے کہ وہ فقط شرقی نہیں نہ فقط غربی ہے، یعنی شرقی بھی ہے اور غربی بھی [لَا شَرْقِیَّةٍ فَقَطْ لَا غَرْبِیَّةٍ فَقَطْ لٰكِنَّهَا شَرْقِیَّةٍ وَّ غَرْبِیَّةٍ]۔ پس وہ مشرق و مغرب دونوں کی خصوصیات کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے۔ اور اس کا نور بھی مشرق اور مغرب دونوں کے لیے ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ اسی نور کے ذریعہ سے انجام کار مشرق و مغرب دونوں مل جائیں گے اور آپ کی ذات بابرکات جامع شرق و غرب ہے۔ اور آپ کا نور کل عالم پر محیط ہے۔ اور اس کے محل وقوع کی طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ نہ مشرق میں ہے یعنی مشرقی ممالک میں سے اور نہ مغرب میں یعنی مغربی ممالک میں۔ بلکہ مشرق اور مغرب کے درمیان میں ہے۔ اور عرب اسی طرح واقع ہے کہ وہ مشرق اور مغرب کے درمیان ہے [بَیْنَ الشَّرْقِ وَالْغَرْبِ]۔ (ر) اور یہ جو فرمایا ﴿یَّكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ﴾ تو اس میں یہ اشارہ ہے کہ نور فطری

وَ يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾

جائیں اور ان میں اس کا نام یاد کیا جائے، ان میں اس کی تسبیح صبح اور شام کے وقتوں میں کرتے رہتے ہیں۔ (2332)

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۪ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾

(ایسے) لوگ جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی۔ (2333)

اپنی روشنی تب دیتا ہے جب تعلق باللہ سے جو نار پیدا ہوتی ہے وہ اسے چھوئے۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ کا نور فطری اس قدر زبردست ہے کہ وہ خود ہی روشن ہو جانے کو تیار تھا اور اس میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے کی زندگی کی طرف اشارہ ہے کہ وہ پہلے سے ہی ایک نہایت درجہ کی پاکیزہ زندگی تھی اور مخلوق خدا کی ہدایت کے سوائے آپ کے دل میں کوئی تڑپ نہ تھی اور اس کا نور کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ تب تعلق باللہ کی نار نے اس فطری نور کو روشن کیا اور اس قلب صافی پر وحی الٰہی کا نزول ہوا۔ اور ﴿نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ﴾ میں بتایا کہ ایک تو وہ فطری نور اس کمال کو پہنچا تھا، پھر دوسرا نور وحی الٰہی اس پر آ پہنچا، اس لیے وہ ﴿نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ﴾ کا مصداق ہو گیا۔ اور ﴿يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ میں اسی ہدایت وحی کی طرف اشارہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب صافی پر نازل ہوئی۔ یوں اس مثال میں بتایا کہ آنحضرت ﷺ کا نور ہر قسم کے شائبہ ظلمت سے خالی، اعلیٰ درجہ کا مصفی، دائمی اور تمام عالم کے لیے ہے اور یہ بھی آپ کی ختم نبوت پر دلیل ہے۔ اور مِصْبَاحٌ کا لفظ لانے میں یہ اشارہ ہے کہ پہلے نبی بھی چراغ تھے مگر یہ چراغ ایسا ہے جو سب عالم کو روشن کرے گا اور کبھی نہ بجھے گا۔

2332- **صحابہ کی شہرت کی پیشگوئی:** ﴿فِيْ بُيُوْتٍ﴾۔ ﴿يُسَبِّحُ لَهٗ﴾ کے متعلق بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس صورت میں فِيْهَا اس سے بدل ہوگا۔ مگر بظاہر پچھلے کلام کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ کیونکہ جب یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نور ہدایت کے لیے جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، تو اب یہ بتایا کہ وہ نور ہدایت کہاں ہے۔ ﴿فِيْ بُيُوْتٍ﴾ بعض گھروں میں ہے اور اِنَّ بُيُوْتَ سے مراد یا تو مسجدیں ہیں اور یا عام گھر اور دونوں معنی مروی ہیں۔ اور تُرْفَعَ سے مراد یہاں تعظیم ہے [دیکھو نمبر: 445]۔ یعنی دنیا میں ان کا نام بلند ہو۔ اور عام گھر مراد لے کر یہ لفظ زیادہ مناسبِ موقع ہے۔ کیونکہ وہ گھر جنہیں دنیا میں کوئی جانتا بھی نہ تھا یعنی مکہ اور مدینہ کے، بغیر دروازوں کی جھونپڑیاں، ان کا نام دنیا کے چاروں کناروں میں روشن ہوا۔ اس لیے کہ وہاں اللہ کے نام کی تسبیح ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر گھروں میں بھی ہوتا تھا اور مسجدوں میں بھی۔ اور يُسَبِّحُ کا فاعل رِجَالٌ ہے جو اگلی آیت میں ہے۔

2333- چونکہ پیچھے ذکر تھا کہ صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں تو یہاں بتایا کہ وہ راہبوں کا گروہ نہیں جو دنیا سے الگ ہو کر تسبیح میں لگ گئے

لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾

تا کہ اللہ انہیں اس کا بہترین بدلہ دے جو وہ کرتے ہیں اور اپنے فضل سے انہیں زیادہ دے اور اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾

اور جو کافر ہیں ان کے عمل چٹیل میدان میں چمکتی ریت کی طرح ہیں، جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آتا ہے اسے کچھ بھی نہیں پاتا اور اللہ کو اپنے پاس پاتا ہے۔ سو وہ اس کا حساب اسے پورا پورا دے دیتا ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ (2334)

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ

یا جیسے گہرے سمندر میں اندھیرے اس کے اوپر ایک لہر چڑھی آ رہی ہے اس کے اوپر ایک اور لہر ہے اس

ہوں، بلکہ وہ تجارت اور بیع بھی کرتے ہیں۔ ہاں یہ مشاغل دنیوی ان کے دلوں کو اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتے اور یہ بیع و تجارت کرنے والا گروہ۔ اور پھر ذکر اللہ سے غافل نہ ہونے والا، نماز قائم کرنے والا، زکوٰۃ دینے والا گروہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور ﴿تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ﴾ سے مراد یا تو اضطراب شدید ہے اور یا یہ مراد ہے کہ ان کے دل وہ باتیں سمجھنے لگیں گے جو پہلے نہ سمجھتے تھے۔ اور آنکھیں ان نتائج کو دیکھنے لگیں گی جو پہلے نہ دیکھتی تھیں۔ گویا ان کی حالت بدل جائے گی۔

2334- سَرَابٍ۔ سَرب سے ہے [دیکھو نمبر: 1604] اور سراب وہ چمکتی ہوئی شے ہے جو بیابان میں پانی کی طرح نظر آتی ہے۔ اور سراب اسے اس لیے کہا جاتا ہے کہ دیکھنے میں چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پس سراب وہ ہے جس کی حقیقت کچھ نہیں۔ ﴿وَّ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝﴾ [النبأ: 20:78] ''اور پہاڑ اڑائے جائیں گے سو وہ ریت ہو جائیں گے۔''

کافروں کے اعمال کو سراب سے مشابہت دی ہے۔ گویا دور سے کچھ نظر آتا ہے مگر فی الحقیقت کچھ نہیں۔ کیونکہ ان کے اعمال سارے دنیا کے لیے ہوتے ہیں۔ ﴿وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ﴾ کے معنی دو طرح ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو سراب کے پاس پاتا ہے یعنی جو کچھ اس نے اس کے لیے مقدر کیا ہے اسے موجود پاتا ہے اور اپنی بدکاریوں کی سزا پاتا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کو اپنے پاس پاتا ہے یعنی اس کا محاسبہ موجود ہوتا ہے۔

ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾

کے اوپر بادل ہے، اندھیرے ہیں جو ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ہیں۔ جب وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے دیکھ بھی نہیں سکتا اور جسے اللہ روشنی نہ دے اسے (کہیں بھی) روشنی نہیں ملتی۔ (2335)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾

کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ (وہ ہے کہ) اس کی تسبیح کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پر پھیلائے ہوئے پرند بھی، ہر ایک اپنی دعا اور اپنی تسبیح کو جانتا ہے اور اللہ اسے جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ (2336)

2335- یہ دوسری مثال کفار کے اعمال کی ہے۔ پہلی مثال تو اعمال دنیا کی بلحاظ نتائج کے ہے کہ وہ سمجھتے ہیں ہم بہت کچھ کر رہے ہیں۔ مگر آخر یہ سب کچھ بے حقیقت ثابت ہوگا۔ اور یہ دوسری مثال اس دنیا کی زندگی کے متعلق ہے۔ اور جس طرح وہاں نور علی نور سے مراد نور فطری اور اس پر وحی الٰہی ہے اور ان دونوں نوروں سے ہر ایک مومن بھی حصہ لیتا ہے، اسی طرح کافر کے لیے بھی اس دنیوی زندگی میں تاریکی ہی تاریکی ہے ﴿ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾۔ ﴿بَحْرٍ لُّجِّيٍّ﴾ گویا جہالت کا سمندر ہے جس میں وہ غرق ہیں۔ اور موج پر موج کا آنا واقعات کے تھپیڑے ہیں جن کی وجہ سے وہ حیرت میں کبھی ایک طرف جھکتا ہے اور کبھی دوسری طرف۔ اور یا مصیبت پر مصیبت مراد ہے اور اس کے اوپر بادل ہے یعنی سماوی روشنی بالکل رکی ہوئی ہے۔ اس قدر ضلالت اور حیرت میں ہے کہ اپنا ہاتھ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اور یہ مثال سخت تاریکی اور جہالت کے اس کامل نور کے مقابل پر ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے سینہ میں روشن ہے۔

2336- ﴿صٰٓفّٰتٍ﴾۔ صَفّ خط مستقیم ہونا ہے۔ اور [صَفّت الطَیرُ] کے معنی ہیں اپنے پر ایک خط مستقیم میں کر دیئے اور انہیں نہ ہلایا۔ ﴿الطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ﴾ کے معنی ہیں اس طرح پر پھیلائے ہوئے۔ (ل)

جب پچھلے رکوع میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نور ہدایت دیا ہے اور اپنی تسبیح سکھائی ہے اور یہ اس کے نور کا ظہور ہے تو اب مناظر قدرت کی طرف توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ظہور اس کی مخلوقات میں کس طرح ہوتا ہے اور اس پہلی آیت میں بتایا کہ ہر ایک چیز یہاں تک کہ پر پھیلائے ہوئے پرند بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں۔ گویا یہ بتایا کہ ان کا پر پھیلانا بھی اپنے رنگ کی تسبیح ہی ہے۔ اور ہر ایک چیز اپنی دعا اور تسبیح سے واقف ہے۔ جیسا دوسری جگہ ہے ﴿وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾

اور اللہ کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور اللہ کی طرف ہی انجام کار پھر کر جانا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾

کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ بادل کو چلاتا ہے، پھر اسے اکٹھا کرتا ہے، پھر اسے تہہ بتہ کرتا ہے، پھر تو بارش کو اس کے اندر سے نکلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور وہ بادل سے جو پہاڑوں کی طرح ہیں، اولے برساتا ہے، پھر وہ اسے پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اسے ہٹائے رکھتا ہے۔ قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر دے۔ (2337)

يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ﴾[بني إسرائيل: 44:17] ''اور کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔'' اور یوں معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہر ایک کی صلوٰت اور تسبیح کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے مگر یہ ﴿وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ﴾ میں بھی آ جاتا ہے۔

2337- يُؤَلِّفُ۔ اِلف اجتماع ہے جس میں اتحاد ہو۔ اسی سے تالیف ہے۔

وَدْقَ وہ ہے جو مینہ کے اندر سے نکلتا ہے اور جو غبار کی طرح ہوتا ہے۔ اور کبھی اس سے مینہ بھی مراد لیا جاتا ہے۔ (غ) بھاری ہو یا ہلکا۔ (ل)

بَرَدٍ۔ بَرْد اصل میں ٹھنڈک کو کہتے ہیں، نیند کو بھی بَرْد کہا جاتا ہے یا اس لیے کہ اس سے ظاہر جلد میں ٹھنڈک آتی ہے اور یا اس لیے کہ اس سے سکون حاصل ہوتا ہے۔ ﴿لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا ۝﴾[النبأ: 24:78] ''نہ اس میں ٹھنڈک پائیں گے اور نہ پینے کی چیز۔'' یعنی نیند اور راحت پیدا کرنے والی زندگی۔ اور بَرَد اسے کہتے ہیں جو بارش کے قطرے گرتے ہوئے ہوا میں ٹھنڈے ہو کر سخت ہو جائیں۔ (غ) اور بَارِدٌ ٹھنڈا ﴿هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ﴾[ص: 42:38] ''یہ ٹھنڈا (پانی) نہانے اور پینے کو ہے۔''

سَنَا چمکتی ہوئی روشنی کو کہا جاتا ہے۔

﴿يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ﴾۔ سَمَآء کے معنی سحاب یعنی بادل ہیں اور ﴿مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا﴾ سے مراد ہے [قَدْرَ

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾

اللہ دن اور رات کو پھیرتا رہتا ہے اس میں آنکھوں والوں کے لیے عبرت ہے۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰۤى اَرْبَعٍ ؕ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾

اور اللہ نے ہر ایک جاندار کو پانی سے پیدا کیا، سو کوئی ان میں سے وہ ہے جو اپنے پیٹ پر چلتا ہے اور کوئی ان میں سے وہ ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے اور کوئی ان میں سے وہ ہے جو چار (پاؤں) پر چلتا ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (2338)

جِبَالٍ، وَأَمْثَالَ جِبَالٍ مِنْ بُرْدٍ] (الطبری، جلد19، صفحہ 202) یعنی پہاڑوں کی مانند اولے۔ (ج) اور مراد جبال سے مجازاً کثرت ہے اور اس معنی میں یہ لفظ اشعار عرب میں استعمال ہوا ہے۔ اور کہا جاتا ہے [عِنْدَهٗ جَبَلٌ مِّنْ ذَهَبٍ وَّجَبَلٌ مِّنْ عِلْمٍ]۔ (ج) یعنی اس کے پاس سونے کا علم یا پہاڑ ہے اور مراد اس سے کثرت ہے اور یا ﴿مِنْ جِبَالٍ﴾ سے مراد ہے [مِنْ قَطْعٍ عِظَامٍ تُشْبِهُ الْجِبَالَ]۔ (ر) یعنی بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے جو پہاڑوں کی مانند ہیں اولے برساتا ہے۔ اور ایک معنی ﴿مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا﴾ کے یوں بھی کیے گئے ہیں کہ جِبَالٌ سے مراد [مَا جَبَلَهُ اللّٰهُ] ہے یعنی جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور گو روح المعانی میں اس قول کو یہ کہہ کر رد کیا گیا ہے کہ لغت اس کی تائید نہیں کرتی۔ مگر لسان العرب میں ثعلب کا قول منقول ہے کہ جَبْلَة جس کے معنی خلقت ہیں اس کی جمع جِبَالٌ ہے۔ اور عرب کے لوگ کہتے ہیں [اَجَنَّ اللّٰهُ جِبَالَهٗ] یعنی اللہ اس کی خلقت کو ڈھانپ دے یا اسے مجنون بنا دے۔

اور یہاں اولوں کے برسانے کا ذکر اور ان سے بعض کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ذکر اس غرض کے لیے ہے کہ بارش جو رحمت الٰہی ہے بعض لوگوں کے لیے ان کے اعمال کی وجہ سے مصیبت بھی بن جاتی ہے۔ اور برق کی چمک سے آنکھوں کے لے جانے میں جس سے مراد ان کا خیرہ کرنا ہے، اشارہ عظیم الشان کامیابیوں کی طرف ہے جو آنکھوں کو خیرہ کر دیں گی۔ اور اگلی آیت میں رات اور دن کے ادل بدل میں بھی اشارہ ایک قوم کی کامیابی اور ایک کی ناکامی کی طرف ہے۔ جیسا کہ خود بتا دیا کہ اس میں عبرت ہے، یعنی ظاہری نظارہ سے گزر کر سبق لینا چاہئے۔

2338- یہ بھی ظاہری قدرت کا ایک نظارہ ہے اور اشارہ یہ ہے کہ جس طرح حیوانات میں مختلف اقسام ہیں، انسانوں میں بھی ہیں۔ پیٹ پر چلنے والے تو بالکل زمین کے ساتھ لگے رہتے ہیں اور زمین پر سے اٹھتے ہی نہیں۔ اس کے مقابل دو پاؤں پر چلنے والے ہیں جو زمین پر سیدھے کھڑے رہتے ہیں جیسے انسان۔ اور پھر ایک درمیانی قسم ہے چار پاؤں پر چلنے والے۔ ان کے سر بھی

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾

ہم نے کھول کر بیان کرنے والی آیتیں اتاری ہیں اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

وَ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ اَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

اور کہتے ہیں ہم اللہ پر اور رسول پر ایمان لائے ہیں اور اطاعت کرتے ہیں، پھر اس کے بعد ان میں سے ایک فریق پھر جاتا ہے اور یہ لوگ مومن نہیں۔

وَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور جب انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے کہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک گروہ منہ پھیرنے والا ہوتا ہے۔

وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ ؕ

اور اگر حق ان کی جانب ہو تو وہ اس کی طرف فرمانبرداری کرتے ہوئے دوڑے آتے ہیں۔(2339)

اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع 6 10 12

کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا وہ شک میں ہیں یا ڈرتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کریں گے۔ بلکہ وہ خود ہی ظالم ہیں۔(2340)

الثلثة

زمین کی طرف ہی جھکے رہتے ہیں، گو وہ بالکل زمین سے پیوست نہیں۔

2339- ﴿مُذْعِنِيْنَ﴾۔ اِذْعَانٌ کے معنی ہیں [اَلْاِسْرَاعُ مَعَ الطَّاعَةِ] فرمانبرداری کرتے ہوئے جلدی کرنا یا انقیاد یعنی جھک جانا۔(ل)

یہ منافقوں کا ذکر ہے۔(ج) لیکن اگر غور کیا جائے تو آج کل مسلمانوں کا یہی نقشہ ہے۔ اللہ اور رسول پر ایمان کا دعویٰ مگر قرآن کے احکام کی پروانہ کرنا، اپنی خواہش کے مطابق بات ہو تو قرآن وحدیث کی حکومت کے آگے سر نیچا کرنا اور یہ ظاہر کرنا کہ ہم تو اسی کو مانتے ہیں، عملاً یہ آج کل کے مسلمانوں کی حالت ہے۔

2340- ﴿يَحِيْفَ﴾۔ حَيْف فیصلہ میں رعایت اور ایک فریق کی طرف مائل ہو جانے کو کہتے ہیں۔(غ)

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾

مومنوں کا جواب جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں، تا کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، یہی ہوتا ہے کہ کہیں ہم نے سن لیا اور ہم فرمانبرداری کرتے ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں۔ (2341)

وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَخْشَ اللّٰهَ وَ يَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ سے ڈرتا ہے اور اس کا تقویٰ اختیار کرتا ہے تو یہی بامراد ہیں۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور وہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں، نہایت زور کی قسمیں کہ اگر تو انہیں حکم دے تو وہ نکل کھڑے ہوں گے۔ کہہ قسمیں نہ کھاؤ، دستور کے مطابق فرمانبرداری چاہئے۔ اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ

کہہ، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ پھر جائیں تو اس پر صرف وہ (پہنچا دینا) ہے جو اس کے ذمہ ڈالا گیا، اور تم پر وہ واجب ہے جو تمہارے ذمہ ڈالا گیا اور اگر اس کی اطاعت کرو گے تو سیدھے رستے پر ہو گے

یعنی خدا اور اس کے رسول کے حکم سے انحراف کی وجہ کیا ہو سکتی ہے سوائے اس کے کہ یا دل میں بیماری ہو یعنی نفاق کی حالت۔ یا اس کے خدا اور رسولوں کے حکم ہونے میں شک ہو یا یہ خیال ہو کہ اللہ اور اس کا رسول کسی کے ساتھ ناانصافی کریں گے۔ اور یہ تینوں باتیں شان ایمان سے بعید ہیں۔ پس مومن کہلا کر اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے انحراف کرنا کسی طرح جائز نہیں۔

2341- جب پچھلے رکوع میں ان لوگوں کا ذکر کیا جو منہ سے ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اللہ اور اس کے رسول کے فیصلوں کی پروا نہیں کرتے۔ تو یہاں بتایا سچے مومن کون ہیں؟ اور ان دونوں باتوں کے ذکر کی ضرورت یہ ہے کہ اب مومنوں کے لیے حکومت اور بادشاہت کا وعدہ دیا جاتا تھا اور اس وعدہ میں شرط ایمان اور عمل صالح ہیں۔ تو پس بتایا کہ صرف نام کی فرمانبرداری ان وعدوں کا مستحق نہیں ٹھہرا سکتی۔

وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾

اور رسول کے ذمے سوائے کھول کر پہنچا دینے کے کچھ نہیں۔ (2342)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾

اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا، جیسا انہیں خلیفہ بنایا جو ان سے پہلے تھے اور وہ ان کے لیے ان کے دین کو جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مضبوطی سے قائم کر دے گا اور وہ ان کے لیے ان کے خوف کے بعد بدل کر امن (کی حالت) کر دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔ اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو وہی نافرمان ہیں۔ (2343)

2342- حُمِّلَ۔ حَمْل ہر ایک قسم کے اٹھانے پر بولا جاتا ہے۔ بوجھ کا اٹھانا، بچہ کا پیٹ میں اٹھانا، پانی کا بادل میں، پھل کا درخت میں، پیغام کا لے جانا، گناہوں کا اٹھانا۔ اور [حَمَّلْتُهٗ وَحَمَّلْتُ عَلَيْهِ] کے ایک ہی معنی ہیں اس پر بوجھ ڈالا۔ جیسے ﴿حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ﴾ [الجمعة: 5:62] ''جن پر توریت کا بوجھ ڈالا گیا'' یعنی انہیں مکلف کر دیا گیا کہ وہ اس کو اٹھائیں، یعنی اس کا حق ادا کریں۔ اور یہاں ﴿عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ﴾ یعنی رسول جس بات کا مکلف کیا گیا ہے وہ خود بتا دی ہے۔ ﴿الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ اور لوگ جس بات کے مکلف کیے گئے ہیں وہ اس کا حق ادا کرتا ہے یعنی اس پر عمل کرنا۔

اس آیت میں رسول کی اطاعت سے مراد کسی صورت میں رسالت کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ رسول بشر کی اطاعت ہی ہے۔ کیونکہ ﴿عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ﴾ بتاتا ہے کہ وہی رسول بشر ہے جو کسی بات کا مکلف کیا گیا ہے۔ مکلف انسان ہو سکتا ہے نہ پیغام۔ یہ آیت اہل قرآن پر قطعی حجت ہے جو بشر رسول کی اطاعت کے منکر ہیں اور اس میں خطاب بھی مسلمانوں کو ہے۔ کیونکہ حُمِّلْتُمْ کا مصداق مسلمان ہی ہو سکتے ہیں جو اپنے منہ کے اقرار سے ان احکام کے مکلف ہو چکے ہیں۔ یہ آیت بھی وعدۂ خلافت کا پیش خیمہ ہے۔

2343- ﴿لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ﴾۔ خَلَفَ اور خَلِيْفَةٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 45] اور خلافت دوسرے کی نیابت ہے۔ اور [خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا] کے معنی ہیں [قَامَ بِالْاَمْرِ عَنْهُ] یعنی دوسرے سے لے کر حکومت کا تعاہد کیا، خواہ اس کے ساتھ ہو یا اس کے بعد۔

(غ) اور [اِسْتَخْلَفَ فُلَانٌ مِنْ فُلَانٍ] کے معنی ہیں اسے اس کی جگہ قائم کیا اور اِسْتَخْلَفْتُہٗ میں نے اسے اپنا خلیفہ یعنی جانشین بنایا اور اِسْتَخْلَفَہٗ اسے خلیفہ بنایا اور خِلَافَۃٌ امارت یا حکومت کو کہتے ہیں۔ اور زجاج کا قول ہے کہ جائز ہے کہ اولیاء اللہ کو اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کے خلیفے کہا جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ﴾ [صٓ: 26:38] ''اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں حاکم بنایا ہے۔'' اور اَوروں نے کہا کہ خلیفۃ سلطان المعظم ہے اور ﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ﴾ [فاطر: 39:35] ''وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں حاکم بنایا۔'' میں فراء کا قول ہے کہ امت محمد ﷺ کو کل امتوں کا جانشین بنایا اور ﴿خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ﴾ کے یہ معنی بھی کیے گئے ہیں کہ تم ایک دوسرے کے جانشین بنتے رہتے ہو۔ اور بیٹے کو جب وہ اپنے باپ کی جگہ میں ہو، کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے باپ کا خلیفہ ہوا۔ (ل)

وعدۂ استخلاف اور حکومت اسلامی:

اس آیت میں تین وعدے صراحت سے دیئے گئے ہیں۔ اوّل: وعدۂ استخلاف، دوم: تمکین دین، سوم: خوف کی جگہ امن قائم کر دینا۔ وعدۂ استخلاف سے عموماً مراد صرف حکومت اور بادشاہت کا ملنا لیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے بنی اسرائیل کو کہا گیا ﴿عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ یَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ﴾ [الأعراف: 129:7] ''قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں جانشین بنائے۔'' اور اسی کی طرف ﴿كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ میں اشارہ ہے۔ یعنی تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تمہیں زمین میں بادشاہ بنا دے گا۔ چنانچہ ابن جریر میں ہے [لَيُوْرِثَنَّهُمُ اللهُ أَرْضَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ، فَيَجْعَلُهُمْ مُلُوْكًا] (تفسیر الطبری، جلد19، صفحہ208) یعنی اللہ تعالیٰ انہیں مشرکین عرب وعجم کی سرزمین کا وارث کر دے گا اور انہیں بادشاہ بنا دے گا۔ ایسے ہی اقوال سب تفاسیر میں ہیں کہ مراد اس سے یہ ہے کہ انہیں ملک میں ایسا تصرف دے گا جو بادشاہوں کو دیا جاتا ہے اور کفار کو ہلاک کر کے ان کا جانشین انہیں بنا دے گا۔ مگر اِسْتِخْلَاف کا لفظ وسیع ہے اور یہاں کفار کے استخلاف کا ذکر نہیں، اور پھر یہاں ذکر امت کا ہے جو رسول سے الگ کر کے کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس آیت سے پہلے بھی اور بعد بھی اطاعت رسول کو فلاح اور فوز کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ تو پس یہاں مراد یہی ہے کہ **امت محمدیہ کو آنحضرت ﷺ کی خلافت دی جائے گی اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ رسول اللہ ﷺ ہی کہلائے**۔ اور آنحضرت ﷺ سے امت کو خلافت ملنا خلافت کے دونوں معنوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یعنی امارت یا حکومت بھی اور ولایت بھی۔ جیسا کہ لفظ خلیفہ میں یہ دونوں مفہوم شامل ہیں۔ کیونکہ نیابت سے مراد ہے کہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا وہ آپ کی امت کو بھی دیا جائے گا اور آپ کو بادشاہت بھی دی گئی اور ہدایت اور ارشاد خلق کا کام بھی دیا گیا اور بنی اسرائیل کو جس کی طرف یہاں الفاظ ﴿كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ میں اشارہ کیا گیا ہے بادشاہت اور نبوت دونوں دیئے گئے ﴿اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا﴾ [المآئدۃ: 20:5] ''جب اس نے تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔'' بلکہ آنحضرت ﷺ کی خلافت میں یہ بھی صاف مفہوم موجود ہے کہ وہ سلطنت جو آنحضرت ﷺ کو دی گئی اور وہ جسمانی اور روحانی دونوں رنگوں پر مشتمل تھی، اسے دوام حاصل ہوگا۔ یعنی بادشاہت اور ولایت مسلمانوں میں ہمیشہ رہے گی۔ کیونکہ امت کا وجود قیامت تک باقی ہے اور امت محمدیہ کی جگہ دوسری کوئی امت دنیا میں نہ

لے گی۔ البتہ پہلے سلسلہ بنی اسرائیل میں خلافت میں نبوت بھی شامل تھی، اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کامل نہ تھی۔ بلکہ اپنے اپنے اوقات میں انبیائے بنی اسرائیل ہدایت و رشد اپنے اپنے زمانہ کے مطابق لاتے رہے۔ اور ایسا ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی امت کے لیے کامل نمونہ نہ تھے بلکہ الگ الگ اخلاق کے الگ الگ نمونے ان میں ہوتے رہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حدیث نبوی ہے کہ [كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الأَنْبِيَاءُ ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لاَ نَبِيَّ بَعْدِي، وَسَيَكُونُ خُلَفَاءُ] (صحيح البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، باب مَا ذُكِرَ عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ: 3455) یعنی بنی اسرائیل کی رہنمائی نبی کرتے تھے، جب ایک نبی فوت ہوجاتا تو دوسرا اس کا جانشین ہوجاتا اور میرے بعد کوئی نبی نہیں اور خلفاء ہوں گے۔ پس وہاں بادشاہت اور نبوت تھی، یہاں بادشاہت اور ولایت رہے گی۔ کیونکہ بادشاہت کی ضرورت تو ہمیشہ ہے اور نبوت کو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ میں کامل کر کے اس کی جگہ ولایت کا سلسلہ جاری فرمایا۔ اگر نبوت آنحضرت ﷺ کی ذاتِ بابرکات میں کمال کو نہ پہنچتی تو اس امت میں بھی نبی ہوتے۔ مگر جب نبی کی ضرورت باقی نہ رہی کیونکہ نور نبوت آنحضرت ﷺ کی ذات میں کمال کو پہنچا ہوا ہر وقت موجود ہے۔ تو اس کی نیابت ولایت سے ہی ہوسکتی تھی۔

خلافت راشدہ:

اس دوہری خلافت میں بعض وجود تو ایسے ہوئے کہ وہ دونوں امور یعنی سلطنت اور رشد و ہدایت کو جمع رکھتے تھے۔ جیسے خلفائے راشدین مہدیین، یعنی خلفائے اربعہ۔ جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے بعد جسمانی اور روحانی دونوں قسموں کی بادشاہت کو اپنے وجود میں جمع کیا۔ کیونکہ یہ وہ پاک لوگ تھے جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے رنگ کو بکمال اپنے اندر لے لیا اور اس کے بعد عموماً بادشاہت اور ولایت کا سلسلہ الگ الگ چلا۔ سوائے اس کے کہ کبھی کسی بادشاہ کو اللہ تعالیٰ نے تجدید دین کے لیے بھی کھڑا کر دیا ہو، جیسے حضرت عمر بن عبدالعزیز۔ اور یہی معنی اس حدیث کے ہیں [الْخِلَافَةُ بَعْدِي ثَلَاثُونَ سَنَةً ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا عَضُوضًا] (مسند البزار) یعنی خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی، پھر بادشاہت ہوگی جس میں لوگوں پر ظلم بھی ہوگا۔ اور وہ بادشاہت چونکہ صرف ایک حصہ خلافت کا اپنے اندر رکھتی ہے اور اس میں بعض مکروہ امور بھی شامل ہوجاتے ہیں، اس لیے اسے خلافت سے الگ کر کے ذکر کیا اور اس بادشاہت والی خلافت میں ملک عرب کی بادشاہت تو امر لازم ہے۔ اس لیے کہ وہ بادشاہت نبی کریم ﷺ کو ملی۔ پس ضرور ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں میں رہے اور احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دائرہ وسیع ہوگا۔ جیسا کہ حدیث [إِنَّ رَبِّي زَوَى لِيَ الأَرْضَ] (سنن أبي داؤد، كتاب الفتن، باب ذِكْرِ الْفِتَنِ وَدَلاَئِلِهَا، حديث:4254) میں ہے، [دیکھو نمبر: 2193]۔ یہی وہ خلافت ہے جس کا مذہبی مسئلہ ہونا آج کئی مسلمانوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا، غیر مسلم تو ایک طرف رہے۔ وہ بادشاہت جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو عطا فرمائی اور جو دین اسلام کے قیام اور تمکین کے لیے اور اس کے بعض ارکان کی حفاظت کے لیے ضروری تھی غیر مسلموں کے ہاتھ میں نہیں جاسکتی۔ بلکہ ضروری ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بادشاہت جسمانی کے وارث بھی مسلمان ہی رہیں۔ اور غیر مسلم سلطنتوں کی اس کے خلاف کوشش اور ملک عرب پر تصرف کرنے کی تدابیر اسی غرض کے لیے ہیں کہ وعدۂ الٰہی کو باطل کریں۔ مگر

اللہ تعالیٰ کے وعدے غلط نہیں ہو سکتے اور اس وعدۂ الٰہی کے خلاف تمام منصوبے انجام کار نیست و نابود ہوں گے۔ ہاں اس وقت مسلمانوں کا بھی فرض ہے کہ جو ذرائع ان کے اختیار میں ہیں وہ ان ناپاک منصوبوں کے خلاف استعمال کریں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں نے خود ایمان فروشی کر کے ہی غیر قوموں کو یہ موقعہ دیا۔ اگر وہ ایمان کو ہاتھ سے نہ دیتے، تو کوئی غیر مسلم طاقت وہاں کسی قسم کا تصرف حاصل نہ کر سکتی تھی۔ تو فی الحقیقت ایمانی حالت کی کمزوری نے خلافت جسمانی کو بھی کمزور کیا ہے۔ اور اس کی وجہ مسلمانوں کا خود خلافت روحانی کے پہلو کو ترک کر دینا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے نزدیک ملک عضوض ہی سب کچھ ہے۔ اور یہ خیال کہ خلافت جسمانی صرف قریش میں ہونی چاہئے صحیح نہیں۔ اسلام سب قوموں کے لیے آیا، جو قوم اپنے اعمال کے لحاظ سے زیادہ حق دار ہوگی وہی خلافت کی مالک ہوگی۔ اور حدیث [اَلْأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ] (مسند أحمد، جلد19، صفحہ 318) کی اصلیت دوسری حدیث سے معلوم ہوتی ہے جہاں آنحضرت ﷺ نے بارہ آئمہ کا ذکر کر کے فرمایا [كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ] (صحيح البخاری، كتاب الأحكام، باب، حديث: 7222, 7223) یہ بارہ امام قریش میں سے ہوں گے۔ اس سے یہ مراد نہ تھی کہ جب تک دنیا قائم ہے قریش میں سے خلفاء ہوتے رہیں گے۔ یہ خلاف واقعات ہے۔ اور قرآن کریم نے صرف ایمان اور عمل صالح کی شرط رکھی ہے، قومیت کی شرط نہیں رکھی۔ اور قومیت کی شرط اصول اسلام کے خلاف ہے۔

خلافت روحانی اور بعثت مجددین:

خلافت روحانی میں اگرچہ اصل ولایت ہی ہے مگر کسی شخص کے منہاج نبوت پر کھڑا کیا جانے کا ذکر بھی صحیح حدیث میں موجود ہے۔ اور یہ حدیث ابوداؤد نے بیان کی ہے [إِنَّ اللهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا] (سنن أبی داؤد، كتاب الملاحم، باب مَا يُذْكَرُ فِي قَرْنِ الْمِائَةِ، حديث: 4293)۔ یعنی اللہ اس امت کے لیے ہر صدی کے سر پر ایک مجدد مبعوث کرتا رہے گا۔ اور امام سیوطی کہتے ہیں [اِتَّفَقَ الْحُفَّاظُ عَلٰى تَصْحِيْحَةِ] یعنی حدیث کے حافظ اس کی صحت پر اتفاق رکھتے ہیں۔ ہمارے زمانہ سے قریب حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی اس حدیث کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ مجددین بالخصوص خلافت روحانی کی طرف لوگوں کو توجہ دلانے والے ہوتے ہیں۔ ہمارے اس زمانہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے جس مجدد کو چودھویں صدی کے سر پر کھڑا کیا ہے اس نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے اور مسلمانوں کی تمام بیماریوں کی اصل جڑ اسی بات کو قرار دیا ہے کہ وہ دین کی طرف سے غافل ہیں۔ اور تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کو ہی اصل علاج قرار دیا ہے۔

اس کے بعد دو وعدے ہیں۔ ایک تمکین دین یعنی دین کا ایسا مضبوط کر دینا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے برباد نہ کر سکے، اور دوسرے خوف کے بعد امن۔ اور ایک خوف تو وہ تھا جو زمانہ نبوی میں تھا، یہاں تک کہ صحابہ نے نبی کریم ﷺ سے شکایت کی کہ یارسول اللہ ہمیں دن رات ہتھیار بند رہنا پڑتا ہے۔ کیا کوئی ایسا وقت آئے گا کہ ہم امن میں ہوں گے؟ تو اللہ تعالیٰ نے خوف کی جگہ امن کر دیا۔ مگر یہ وعدہ استمراری ہے یعنی ہر حالت خوف کے بعد امن ہو جائے گا۔ اور اعدائے دین کا خوف مسلمانوں کو نہ

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، اور رسول کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (2344)

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾ ع 7 7 13

(یہ) خیال نہ کر کہ جو کافر ہیں وہ زمین میں (ہمیں) ہرا دینے والے ہیں اور ان کا ٹھکانا آگ ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَ الَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں اور وہ جو تم میں سے بلوغ کو نہیں پہنچے، چاہیے

رہے گا۔ یہ آیت اہل تشیع پر قطعی حجت ہے کہ سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت حق ہے۔ اس لیے کہ جو معیار خلافت کا قرار دیا تھا وہ کامل طور پر انہی دو خلافتوں میں پورا ہوا۔ یعنی تمکین دین اور تبدیل خوف بامن۔

﴿يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا﴾۔ ﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے حال ہے یعنی یہ وعدہ ان کے ساتھ ہے جو میری عبادت کرتے ہیں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور یا استخلاف کی علت ہے یعنی چونکہ یہ لوگ میری عبادت کرتے ہیں اس لیے میں انہیں زمین میں بھی بادشاہ بناؤں گا اور یا اس میں بھی ایک پیشگوئی ہے کہ اس ملک عرب کے اندر میری ہی عبادت ہوگی اور شرک مٹ جائے گا۔

﴿مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ﴾ میں لفظ بمقابلہ ایمان بھی ہوسکتا ہے اور بمقابلہ لشکر بھی۔ اوپر چونکہ مسلمانوں پر نعمتوں کا ذکر ہے اس لیے مراد کفران نعمت ہی ہے۔ یعنی اگر پھر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے خروج کریں تو پھر وہ فاسق ہیں اور ایسے عہد شکنوں کے ساتھ خدا کا وعدہ کیونکر قائم رہ سکتا ہے، سو ایسا ہی ہوا۔ اور خلافت کی کمزوری یا اس کی بربادی مسلمانوں کی ناشکری کا ہی نتیجہ ہے۔ گو غیر قوموں کی طرف سے ہی وہ وقوع میں آئی ہو۔

2344- جب مسلمانوں کو اپنی ناشکری اور عہد شکنی سے مصائب آ جائیں تو ان کا علاج بتایا ہے۔ نماز، زکوٰۃ، اطاعت رسول۔ نماز اور زکوٰۃ چونکہ دو بڑے رکن ہیں اس لیے ان کا ذکر بالخصوص کیا ہے۔ اور اصل رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہی ہے یعنی اس راہ پر چلنا جس پر آپ نے چلایا تھا، جو ان مصائب کو دور کر سکتی ہے۔ دوسری قوموں کی نقل اسلام کی مصائب کو دور نہیں کر سکتی۔ اگلی آیت میں بتایا کہ کفار کا کتنا بھی غلبہ نظر آئے وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ	کہ تین دفعہ تم سے (اندر آنے کی) اجازت لے لیا
صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ	کریں۔نماز فجر سے پہلے۔اور جب تم (گرمی کی) دوپہر کو
مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَ مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۫ؕ	اپنے کپڑے اتار دیتے ہو اور نماز عشاء کے بعد تین
ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَ لَا	وقت تمہارے پردے کے ہیں۔ان کے بعد نہ تم پر اور نہ
عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ	ان پر کوئی گناہ ہے۔تم ایک دوسرے کے پاس پھرتے
عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ	پھراتے ہی رہتے ہو،اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے حکم
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ	کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا
حَكِيْمٌ ﴿۵۸﴾	ہے۔(2345)

2345- ظَّهِيْرَةِ۔ ظُهْر مشہور ہے اور وہ دن کا نصف ہے اور اس کی وجہ تسمیہ یا تو یہ ہے کہ وہ دیکھنے میں نماز کا ظاہر ترین وقت ہے۔یعنی ہر شخص کو خود بخود معلوم ہو جاتا ہے اور یا یہ کہ وہ گرمی کے لحاظ سے سب سے زیادہ تیز ہے۔اور بعض کے نزدیک یہ کہ وہ پہلی نماز ہے جو ظاہر ہوئی یعنی پڑھی گئی۔اور ظَّهِيْرَة سخت گرمی کی دوپہر کا وقت ہے اور سردیوں کی دوپہر کو ظَّهِيْرَة نہیں کہا جاتا۔(ن)

اس رکوع میں بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں بیان کی ہیں اور مراد اس سے یہ سمجھانا ہے کہ بڑی بڑی بدیاں چھوٹے چھوٹے امور کی طرف توجہ کرنے سے رک جاتی ہیں۔اس آیت میں خلوت کی قدر سکھائی ہے۔پچھلے رکوع میں بادشاہت کا وعدہ تھا جس کا حصول ہر قوم کا پہلا مقصد ہوتا ہے۔مگر انسان کو راحت صرف اس سے نہیں پہنچتی بلکہ اس کے گھر کے اندر چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اس کی راحت میں معاون ہوتی ہیں۔اور انہی سے اس کے لیے یہ دنیا اس کی زندگی بہشت یا دوزخ کا نمونہ بنتی ہے اور بالخصوص میاں بی بی کے محبت آمیز تعلقات میں تسکین قلب ملتی ہے۔پس جو امور اس میں مخل ہو سکتے ہیں انہیں روکا ہے۔یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دیگر اوقات میں غلام اور نابالغ لڑکے آ جا سکتے ہیں۔گویا ان سے پردہ نہیں،اور نہ انہیں اذن لینے کی ضرورت ہے۔مگر میاں بی بی میں بے تکلفی کی حالت اور محبت آمیز امور دوسرے لوگوں کے سامنے نہ ہونے چاہئیں۔

یورپ کی تہذیب نے ان امور کو جو خلوت سے تعلق رکھتے تھے جلوت میں لا کر اخلاق انسانی کا ستیاناس کر دیا ہے اور فسق و فجور کی رو تمام حد بندیوں سے باہر نکل گئی ہے۔جوان مرد اور عورتیں کھلے میدانوں میں بیٹھ کر وہ کام کرتے ہیں جنہیں دیکھ کر شرم بھی شرما جاتی ہے۔جن باتوں کو چھوٹا سمجھا جاتا تھا وہی آج کے فسق و فجور کا اصل علاج ہیں۔اور یورپ آج عرب سے زیادہ ان ہدایت کا محتاج ہے۔اور یہ جو فرمایا ﴿حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ﴾ تو مراد اس سے دن کا لباس اتار دینا اور سونے کے لباس کا پہن لینا ہوں گے،ننگے ہونا مراد نہیں۔جیسا کہ آگے بوڑھی عورتوں کے ذکر میں آتا ہے ﴿اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ﴾ وہ اپنے

وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾

اور جب تم میں سے لڑکے بلوغ کو پہنچ جائیں تو چاہیئے کہ وہ (اندر آنے کی) اجازت لے لیا کریں، جس طرح وہ اجازت لیتے رہے جو اِن سے پہلے ہیں۔ اسی طرح اللہ اپنے حکم تمہارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔(2346)

وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ؕ وَ اَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۶۰﴾

اور بڑی عمر کی عورتیں جو نکاح کی امید نہیں رکھتیں ان پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے (اوپر کے) کپڑے اتار رکھیں، بغیر اس کے کہ سنگار دکھاتی پھریں اور وہ اپنے آپ کو بچائے رکھیں تو ان کے لیے بہتر ہے۔ اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔(2347)

کپڑے اتار دیں اور مراد خاص ان کپڑوں کا اتارنا ہے جو زینت کے مقاموں کو ڈھانکنے کے لیے لئے جاتے ہیں۔

2346- ﴿الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جن کا ذکر قرآن شریف میں پہلے ہوا۔ ﴿حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا﴾[27] اور یہ بھی ہے کہ جو ان سے پہلے بلوغ کو پہنچے ہیں۔

2347- ﴿الْقَوَاعِدُ﴾۔ قَاعِدَۃ کی جمع ہے۔ جو عورت حالت حیض اور تزوّج سے رہ گئی ہو۔ (غ) اور قَاعِدٌ کی جمع بھی قَوَاعِدُ ہے، اور قَاعِدٌ عمر رسیدہ عورت کو کہا جاتا ہے۔ (ف)

﴿مُتَبَرِّجٰتٍۭ﴾۔ یعنی عورت نے اظہار حسن میں خوبصورت نشانوں والے کپڑے سے مشابہت پیدا کی۔ (غ) پس تَبَرُّج حسن کو نمایاں کر کے دکھانا ہے اور تَبَرُّج کی اصل حقیقت یہ ہے کہ تکلف سے ان محاسن کو ظاہر کرے جن کا چھپانا واجب ہے۔ (ر۔غق) اور کہا گیا ہے کہ عورتیں اپنی چال میں تکبر اور تبختر اختیار کیا کرتی تھیں یعنی ناز و انداز سے چلنا۔ اور تَبَرُّج ایسا اظہار زینت ہے جس سے مرد کی شہوت کو تحرک میں لایا جائے۔ (ل) اور عرب میں عورتوں کا بناؤ سنگار کر کے باہر نکلنا اسی طرح مروج تھا جس طرح یورپ میں مروج ہے۔

اس آیت میں ان عورتوں کو پردہ کے کپڑے اتار دینے کی اجازت دی ہے جو عمر رسیدہ ہوگئی ہوں۔ یوں تو معمر عورتیں پوری

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآىِٕكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع 8 4 14

اندھے پر کوئی تنگی نہیں اور نہ لنگڑے پر کوئی تنگی ہے، اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے اور نہ خود تم پر کہ تم اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپوں کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا وہ جس کی چابیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوست کے (گھر سے)۔ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ سب اکٹھے کھاؤ یا الگ الگ۔ پس جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کہا کرو، دعائے خیر اللہ کی طرف سے برکت دی گئی پاکیزہ۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے حکم کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔ (2348)

آزادی کے ساتھ باہر نکل سکتی ہیں اور ہر قسم کے کاروبار میں پورا حصہ لے سکتی ہیں۔

2348- الْاَعْرَجِ۔ عُرُوج اوپر چڑھنا ﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ﴾ [المعارج: 4:70] ''فرشتے اور روح چڑھتے ہیں۔'' ﴿فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ﴾ [الحجر: 14:15] ''پھر وہ اس میں چڑھنے لگیں۔'' اور مَعَارِج کے معنی مصاعد ہیں۔ ﴿ذِي الْمَعَارِجِ﴾ [المعارج: 3:70] ''جو بلند مرتبوں والا ہے۔'' اور [لَيْلَةُ الْمِعْرَاجِ] اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں دعائیں اوپر چڑھتی ہیں جس کی طرف آیت میں اشارہ ہے ﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ [فاطر: 10:35] ''اسی کی طرف پاک کلمے چڑھتے ہیں۔'' اور عَرَج کے معنی ہیں اس طرح چلا جس طرح اوپر چڑھنے والا چلتا ہے۔ اور عِرَج کے معنی ہیں اس کی بناوٹ ایسی ہوگئی۔ اس لیے اَعرَج لنگڑا ہے۔

صَدِيْقِ۔ صَداقَة کے ایک معنی محبت میں صدق اعتقاد ہیں اور انسان سے خاص ہے۔ (غ) ﴿وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ﴾ [الشعرآء:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ	مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں
رَسُوْلِهٖ وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ	اور جب کسی بات کے لیے جہاں جمع ہونے کی ضرورت
لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ	ہے اس کے ساتھ جمع ہوتے ہیں، تو جاتے نہیں جب تک
الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ	کہ اس سے اجازت نہ لے لیں۔ وہ لوگ جو تجھ سے اجازت
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ	لیتے ہیں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے

101:26] ''اور نہ کوئی غم کھانے والا دوست ہے۔''

اَشْتَاتًا۔ شَتّٰ قبیلہ کے پراگندہ ہوجانے کو کہا جاتا ہے۔ اور اشتات کے معنی ایسی حالت ہیں کہ ان کے نظام میں پراگندگی تھی۔ ﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا﴾ [الزلزال: 6:99] ''اس دن لوگ الگ الگ ہوکر نکل پڑیں گے۔'' اور ﴿نَبَاتٍ شَتّٰى﴾ [طٰہٰ: 53:20] میں مراد مختلف انواع کی سبزیاں ہیں اور ﴿قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى﴾ [الحشر: 14:59] ''ان کے دل علیحدہ علیحدہ ہیں۔'' میں مراد ہے کہ ان میں باہم الفت نہیں۔

اندھے اور لنگڑے اور بیمار پر حرج نہ ہونے سے کیا مراد ہے؟ ابن جریر میں ایک قول تو یہ ہے کہ اندھے، لنگڑے، بیمار کے ساتھ کھانا کھانے میں مضائقہ کرتے تھے۔ اس خیال سے کہ ان کے طعام کا کوئی حصہ نہ کھا جائیں۔ تو یہاں اجازت دی گئی ہے کہ تم اندھوں وغیرہ کے ساتھ بھی کھانا کھا سکتے ہو۔ اور یا اس لیے کہ اہل جاہلیت اندھے وغیرہ کے ساتھ کھانا کھانا پسند نہ کرتے تھے۔ دونوں صورتوں میں اندھے کے ساتھ مل کر کھانا کھانے کی اجازت دی گئی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ آیت کی رو سے ایسے لوگوں کو اپنے ساتھ لے جا کر دوسروں کے گھروں سے کھانا کھلانا جائز ہے، جب اپنے گھر میں نہ ہو۔ اور ایک یہ کہ ایسے لوگ چونکہ غزوات میں پیچھے رہ جاتے تھے تو ان کو اجازت دی ہے کہ پیچھے وہ ان کے گھروں سے کھانا کھا سکتے ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ مراد اس سے غزوات میں پیچھے رہ جانے میں حرج کا نہ ہونا ہے۔ میرے نزدیک جس بات میں حرج نہیں اسے خود بیان فرما دیا ہے ﴿اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ﴾ یعنی اس بات میں حرج نہیں کہ ایسے معذور لوگ اپنے قریبی عزیزوں کے گھروں سے کھانا کھالیں۔ اصل غرض تو اس بات کا بیان کرنا ہے کہ کسی شخص پر تنگی نہیں ڈالی گئی کہ وہ اپنے عزیزوں اور قریبیوں کے گھر سے کھانا نہ کھائے۔ کیونکہ جب اوپر عزیز سے عزیز یہاں تک کہ ماں اور باپ اور بہن کے گھر جانے کے لیے اجازت ضروری ٹھہرائی، تو اس سے یہ خیال گزرنا ممکن تھا کہ ان کے ساتھ معاملہ غیروں کا سا ہے۔ اس لیے کسی قسم کی بے تکلفی بھی جائز نہیں۔ اور اس بے تکلفی میں بڑا حصہ یہ ہے کہ انسان دوسرے کے گھر سے کھانا کھالے۔ اس لیے فرمایا کہ ان کے گھروں سے کھانا کھانے کی ممانعت نہیں ہے۔ گویا بتایا کہ اجازت لینے کی ضرورت اور وجوہات پر ہے نہ اس وجہ پر کہ ان کو غیر سمجھا گیا ہے۔ اور اس کی ابتدا اس بات سے کی کہ اندھے، لنگڑے، بیمار پر کوئی تنگی نہیں کہ وہ اپنے عزیزوں کے

فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ ہیں۔پس جب وہ اپنے کسی کام کے لیے تجھ سے اجازت
فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ مانگیں تو تُوان میں سے جسے چاہے اجازت دے دے،

گھروں سے کھانا کھائیں۔اس لیے کہ بوجہ معذور ہونے کے اس بات کے مستحق تھے کہ انہیں ایسی اجازت دی جاتی۔اوران کے خصوصیت سے ذکر میں یہ اشارہ ہے کہ وہ اس بات کے اہل ہیں کہ انہیں کھانا کھلایا جائے۔اور یا جس بات میں حرج نہیں اس کا ذکر ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا﴾ میں کیا ہے۔یعنی ان کے ساتھ مل کر کھانے میں بھی حرج نہیں۔ اوراگر کوئی صورت کراہت وغیرہ کی ہوتو اس میں بھی حرج نہیں کہ ایسے معذوروں سے علیحدہ کھانا کھالیا جائے۔

بُيُوْتِكُمْ کے معنی اپنے گھر ہیں،یعنی جہاں انسان کے بی بی بچے ہوں۔اوراس کا ذکر اس لیے کیا کہ قریبی رشتہ داروں کے گھر ایسے ہی ہیں جیسے اپنے گھر۔مگراس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان دوسرے رشتہ داروں پر بوجھ بن کر پڑا رہے۔بلکہ مطلب صرف اس قدر ہے کہ اگران کے گھر جائے اور کھانے کا وقت ہوتو وہاں کھانا کھالینے میں کوئی حرج نہیں۔مدعیان تہذیب کی طرح نہیں کہ باپ بیٹے کے گھر جائے اور بیٹا باپ کے،تو اس کا بل بھی ادا کرنا پڑے۔بہت دلوں میں یہ خیال گزرتا ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ چھوٹی چھوٹی باتیں کیوں بیان کیں؟ وہ آج یورپ کی حالت کو دیکھیں تو انہیں معلوم ہو کہ قرآن شریف کا ایک ایک لفظ موجودہ تہذیب کی بیماریوں کے علاج کے لیے نازل ہوا ہے۔علم اور تہذیب کے دعویداروں کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ باپ کے گھر بیٹا یا بیٹے کے گھر باپ یا بھائی کے گھر بہن یا چچا کے گھر بھتیجا مہمان جائے تو وہ اخلاق انسانی کو جواب دے کر کھانے کا بل ان کے سامنے نہ رکھا کریں۔

﴿اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ﴾ سے مراد ایک قول میں جائیداد کا منتظم ہے کہ وہ اس جائیداد میں سے اپنی خوراک کے لیے لے سکتا ہے۔اوربعض کے نزدیک مراد خود اپنی مملوکہ چیزوں سے ہے،جن میں غلام بھی داخل ہوجاتے ہیں۔اوربعض کے نزدیک مراد یہ ہے کہ غزوات میں معذور لوگوں کو پیچھے جائیدادوں وغیرہ پر چھوڑا جاتا تھا تو انہیں اجازت دی ہے کہ وہ جائیدادوں کا انتظام کریں تو بقدر کفایت اس میں سے کھا بھی سکتے ہیں۔(ج)

جَمِيْعًا اکٹھے مل کر کھانا کھانا،یعنی ایک دسترخوان اور ایک میز پر خواہ ایک برتن میں سے ہوں یا الگ الگ برتنوں سے۔اور اَشْتَاتًا اکیلے اکیلے کھانا کھانا،دونوں صورتوں میں اجازت دی ہے،اور یہ اجازت عام ہے۔یعنی اندھے،بیمار وغیرہ سے مل کر کھانا یا علیحدہ کھانا،عزیزوں یا قریبیوں کے ساتھ مل کر کھانا یا الگ کھانا،مہمان کے ساتھ مل کر کھانا یا اس سے الگ کھانا، غیروں کے ساتھ مل کر کھانا یا الگ کھانا،غنی کا غریب کے ساتھ،بلند مرتبہ انسان کا چھوٹے مرتبہ والے لوگوں سے مل کر کھانا یا الگ کھانا،یہ سب جائز ہے۔کیونکہ جیسا کہ ابن جریر میں ہے ان میں سے غنی غریبوں کے ساتھ مل کر نہ کھاتے تھے۔جیسا اب بھی یورپ میں رواج ہے کہ بڑا آدمی چھوٹے کے ساتھ ایک میز پر نہیں بیٹھتا اور نہ سپاہی افسر کے ساتھ میز پر بیٹھ سکتا ہے۔اور بعض قبائل ایسے تھے کہ ان میں سے کوئی شخص اکیلا نہ کھاتا تھا،اور یہ بھی تنگی تھی۔اور بعض ایسے تھے کہ وہ اندھوں وغیرہ کے ساتھ مل کر کھانا پسند نہ کرتے تھے۔اوربعض ایسے تھے کہ مہمان آجائے تو جائز نہ سمجھتے تھے کہ مہمان سے الگ کھائیں،اور

وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾

اور ان کے لیے اللہ سے استغفار کر۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (2349)

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

رسول کے بلانے کو آپس میں ایسا قرار نہ دو جیسا تمہارا ایک دوسرے کو بلانا ہے۔ اللہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے چھپ کر نکل جاتے ہیں۔ پس چاہئے کہ وہ لوگ ڈریں جو اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں کہ وہ آزمائش میں نہ پڑیں یا انہیں دردناک عذاب نہ پہنچے۔ (2350)

گو الگ الگ کھانا جائز ہے۔ مگر مل کر کھانے کو فضیلت ہے، قرآن کریم نے اسے مقدم کیا ہے۔ اور ابن ماجہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [كُلُوا جَمِيعًا وَلاَ تَفَرَّقُوا فَإِنَّ الْبَرَكَةَ مَعَ الْجَمَاعَةِ] (سنن ابن ماجه، كتاب الأطعمة، باب الاجتماع على الطعام، حديث: 3287)۔ (ث) مل کر کھاؤ اور الگ الگ نہ کھاؤ، کیونکہ جماعت میں برکت ہے۔ پس ایک گھر کے لوگوں کا بھی ایک دسترخوان پر اکٹھے بیٹھ کر کھانا بہتر ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ اپنی بیبیوں کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے تھے۔

2349- جَامِعٍ۔ [اَمْرَ جَامِعٌ] وہ امر ہے جس کی اتنی اہمیت ہو کہ لوگ اس کے لیے اکٹھے ہو جائیں۔ گویا خود اس امر نے ہی لوگوں کو جمع کیا ہے۔ (غ) جیسے جنگ یا نماز جس کے لیے اجتماع ہو یعنی جمعہ، عیدین وغیرہ۔ یا کسی معاملہ میں مشورہ جو پیش آ گیا ہو۔ (ج) اور ﴿يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ﴾ [هود: 103:11] ''جس دن میں سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے۔'' میں مراد وہ دن ہے جس میں لوگ جمع کیے جائیں۔ (غ)

چونکہ پچھلے رکوع میں خانگی امور کی اہمیت پر زور دیا تھا تو اب بتایا ہے کہ اس میں بھی افراط نہ ہو۔ قومی یا دینی معاملات ذاتی معاملات پر ترجیح رکھتے ہیں۔ پس جب کسی قومی یا دینی معاملہ کے لیے طلب کیا جائے تو نہ صرف حاضر ہوں بلکہ حاضری کے بعد بھی نہ جائیں جب تک رسول اللہ ﷺ سے اجازت نہ لے لیں۔ آج مسلمانوں کی مجالس قومی کی یہ حالت ہے کہ اول تو وہاں لوگ آتے نہیں، اور جو آتے ہیں تو پابندی کا کوئی خیال نہیں۔ ﴿فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ﴾ بتاتا ہے کہ خانگی امور ایسے نہیں کہ ہر ضرورت کے لیے اجازت دی جائے۔ بلکہ کوئی اہم معاملہ ہو یا بہت نقصان ہوتا ہو تو اجازت دینی چاہئے۔ اور رسول کے بعد امام کی اجازت بکار ہوگی یا کسی مجلس میں اس کے صدر کی۔

2350- ﴿يَتَسَلَّلُوْنَ﴾۔ سَلّ کسی چیز کا کھینچ لینا اور نرمی سے اس کا نکال لینا ہے۔ اور اِنْسِلَالٌ تنگی یا انبوہ سے نکل جانا اور گزر جانا

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَ يَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾ ع 9 3 15

سن رکھو اللہ کے لیے ہی ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ جانتا ہے جس (حال) پر تم ہو اور جس دن اس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو وہ انہیں اس کی خبر دے گا جو وہ کرتے تھے۔ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

ہے۔ اور چھپ کر نکل جانا بھی اس سے مراد ہوتا ہے۔ اور ﴿يَتَسَلَّلُوْنَ﴾ اور ﴿يَنسِلُونَ﴾ کے ایک ہی معنی ہیں۔ (ل)

﴿لِوَاذًا﴾۔ لَاوَذَ (يُلَاوِذُ) سے ہے جس کے معنی ہیں کسی دوسری چیز کی آڑ لی یعنی اس کے ذریعہ سے چھپ گیا اور مطلب یہ ہے کہ دوسرے کو آڑ بناتے ہوئے یکے بعد دیگرے نکل جاتے ہیں۔ (غ)

یہاں صاف فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا بلانا تمہارے ایک دوسرے کو بلانے کی طرح نہیں، کیونکہ ایک دوسرے کا بلانا ذاتی یا دنیوی ضروریات کے لیے ہوتا ہے اور رسول کا بلانا محض اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ بعض نے ﴿دُعَآءَ الرَّسُوْلِ﴾ سے مراد رسول اللہ کا اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا لے کر آنحضرت ﷺ کی استجابت دعا کا یہاں سے استنباط کیا ہے۔ اور بعض نے ﴿دُعَآءَ الرَّسُوْلِ﴾ سے مراد لیا ہے لوگوں کا رسول کو بلانا، اور اس سے یہ استنباط کیا ہے کہ جس طرح ایک دوسرے کو یا فلاں کہہ کر پکارا جاتا ہے اس طرح پر آنحضرت ﷺ کو نام لے کر نہیں پکارنا چاہئے بلکہ یا رسول اللہ یا نبی اللہ کہہ کر پکارنا چاہئے۔ مگر حقیقت میں ﴿دُعَآءَ الرَّسُوْلِ﴾ سے مراد رسول کا دین حقہ کی طرف دعوت دینا ہے اور اہم دینی امور کے لیے بلانا اس میں آجاتا ہے اور سیاق اسی معنی کو چاہتا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے جو دعوت دی تھی تو اس کا منشا یہ تھا کہ دین حق دنیا میں پھیلایا جائے اور لوگوں کو نیکی کی تعلیم دی جائے اور بری باتوں سے روکا جائے۔ آج مسلمان رسول اللہ ﷺ کی اس دعوت کو ایک دوسرے کی دعوت کی طرح بھی قرار نہیں دیتے۔ ایک دوسرے کو جس کام کی طرف بلاتے ہیں اُدھر رُخ کرنا آسان ہو رہا ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی طرف توجہ نہیں کرتے، اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ اسی کا نتیجہ فتنہ یا عذاب الیم ہے، جس میں اس وقت مسلمان مبتلا ہیں۔

سورۃ الفرقان

نام:

اس سورت کا نام الْفُرْقَانِ ہے اور اس میں 6 رکوع اور 77 آیات ہیں۔ الفرقان کے نزول کا ذکر اس سورت کی پہلی ہی آیت میں ہے اور اس سورت میں چونکہ یہ دکھایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے کیا کھلا کھلا فرق حق و باطل میں ہو گیا ہے اس لیے اس کا نام الفرقان اسی مضمون کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے۔

خلاصہ مضمون:

① پہلے رکوع میں یہ بتا کر کہ نزول فرقان تمام قوموں کے لیے ہے ان اعتراضوں کا ذکر کیا ہے جو مخالفین رسول اللہ ﷺ پر کرتے تھے۔

② دوسرے رکوع میں ان اعتراضوں کا جواب دیتے ہوئے بتایا ہے کہ جس رنگ کا فرقان یہ چاہتے ہیں کہ رسول کو دنیا میں حکومت و بادشاہت حاصل ہو وہ بھی قائم کر دیا جائے گا۔

③ تیسرے رکوع میں مکذبین کے لیے یوم فرقان یعنی جنگ بدر میں قوت توڑا جانے کی پیشگوئی کی اور آخر رکوع میں بتایا کہ قرآن کریم میں سب اعتراضوں کا جواب موجود ہے۔

④ چوتھے میں کچھ ذکر پہلی قوموں کا کر کے عرب کی اس حالت کا ذکر کیا جو رسول اللہ ﷺ کے آنے سے پیشتر تھی۔ اور بتایا کہ ان لوگوں کی حالت چارپایوں کی طرح ہو چکی تھی۔

⑤ پانچویں میں نظارۂ قدرت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہ آفتاب کے طلوع سے کس طرح ظلمت آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہے اور بڑی بارش سے پہلے کس طرح ہوائیں بتا دیتی ہیں کہ بارش آ رہی ہے، یہ بتایا کہ انقلاب روحانی کا آغاز ہو چکا ہے اور

⑥ چھٹے میں اس عظیم الشان انقلاب روحانی کا ذکر کیا کہ کس حالت سے نکال کر کس بلند مقام پر یہ رسول اپنے متبعین کو اس تھوڑے عرصہ میں پہنچا چکا ہے۔

تعلق:

اس سے پہلے سورۂ نور گزری ہے جو حالانکہ مدنی ہے، مگر چونکہ اس میں رسول اللہ ﷺ کو ایک اعلیٰ درجہ کے کامل نور سے تشبیہ دی گئی تھی جس کے متعلق یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ وہ نور مشرق و مغرب پر محیط ہو جائے گا۔ اس لیے اس کے بعد اس سورت کو رکھا ہے جو بتاتی ہے کہ وہ کون سی باتیں ہیں جو قرآن کریم اپنے متبعین کے اندر پیدا کرتا ہے، اور یوں ظاہر طور پر ایک فرقان یعنی حق و

اٰیَاتُهَا 77 (25) سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ مَكِّيَّةٌ (42) رُكُوْعَاتُهَا 6

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ﴿۱﴾

وہ (ذات) بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا، تاکہ وہ تمام جہان کے لیے ڈرانے والا ہو۔ (2351)

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ﴿۲﴾

وہ وہی ہے جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور اس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ حکومت میں اس کا کوئی شریک ہے اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھہرایا۔ (2352)

باطل میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔

زمانۂ نزول:

اس سورت کے نزول کے متعلق جمہور کا قول ہے کہ یہ مکی ہے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے تین آیتوں کو جو ﴿وَ الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ سے شروع ہوتی ہیں مدنی کہا ہے۔ مگر اس کی کوئی وجہ نہیں۔ تاریخ نزول کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اس میں اس انقلاب روحانی کا ذکر ہے جو رسول اللہ ﷺ کے آنے سے پیدا ہو چکا تھا اس لیے اس کا زمانہ آخری مکی زمانہ ہے اور غالباً صحابہؓ کی ہجرت مدینہ سے کچھ پیشتر کا ہے۔

2351- یہاں قرآن کی بجائے فرقان کا لفظ اختیار کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ حق و باطل میں عملی طور پر فرق کر دکھائے گا۔ اور پچھلی سورت میں لفظ نور کی مناسبت سے جس میں عالم میں تمیز پیدا ہوتی ہے یہاں قرآن کریم کا نام فرقان حمید ہی موزوں تھا۔ اور اسی لیے اس سورت میں اول کفار کی حالت کا ذکر کر کے آخر پر مومنوں کی حالت بیان فرمائی ہے اور یوں بتایا ہے کہ وہ کتاب جس نے اتنا بڑا انقلاب روحانی پیدا کر دیا، وہ بشر کا کلام نہ ہو سکتی تھی۔ اور عٰلَمِيْنَ کے لفظ میں تمام قومیں بلحاظ مکان بھی شامل ہیں خواہ وہ کہیں ہوں اور تمام نسلیں بلحاظ زمان بھی شامل ہیں خواہ وہ کبھی پیدا ہوں۔ ان سب کے لیے نذیر آپؐ ہی ہیں۔

2352- ﴿تَقْدِيْرًا﴾ کے دو ہی مفہوم ہیں۔ ایک قدرت کا عطا کرنا، دوسرا ان کو اقتضائے حکمت کے مطابق ایک خاص اندازہ اور خاص وجہ پر بنانا۔ [دیکھو نمبر: 987] اور اشیاء کی تقدیر انہی دو معنوں میں ہو سکتی ہے، کوئی تیسرے معنی اس سے مراد لینا صحیح نہیں۔

وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ وَ لَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا وَّ لَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَیٰوةً وَّ لَا نُشُوْرًا ۝۳

اور (لوگوں نے) اس کے سوائے معبود بنالیے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے گئے ہیں۔ اور ان کو اپنے برے بھلے کا بھی اختیار نہیں اور نہ موت اور نہ زندگی اور نہ مر کر جی اٹھنا ان کے اختیار میں ہے۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَ اَعَانَهٗ عَلَیْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚۛ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا ۚۛ ۝۴

اور جو کافر ہیں کہتے ہیں یہ تو نرا جھوٹ ہے جو اس نے گھڑ لیا ہے، اور اس پر اسے اور لوگوں نے مدد دی ہے۔ یہ ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوئے۔ (2353)

دوسرے خود قرآن کریم نے جہاں تقدیر کا ذکر کیا ہے انسان کے لیے علیحدہ ذکر نہیں کیا بلکہ اپنی تمام مخلوق کے لیے تقدیر کا ذکر کیا، جیسے یہاں۔ یا ﴿الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝﴾ [الأعلیٰ: 2:87, 3] ''جس نے پیدا کیا، ٹھیک بنایا۔ جس نے (حد کا) اندازہ لگایا پھر راہ دکھائی۔'' میں اور جہاں تقدیر کا ذکر خصوصیت سے کیا تو وہ انسان کے لیے نہیں بلکہ یا تو اجرام سماوی کے لیے ہے ﴿وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝﴾ [الأنعام: 96:6] ''اور سورج اور چاند کو حساب کے لیے۔ یہ غالب علم والے کا اندازہ ہے۔'' ﴿وَ الشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝﴾ [یٰسٓ: 38:36] ''اور سورج اپنے مقرر رستے پر چلتا رہتا ہے۔ یہ غالب علم والے کا اندازہ ہے۔'' ﴿وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ ۖۚ وَ حِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝﴾ [حٰمٓ السجدة: 12:41] ''اور ہم نے ورلے آسمان کو ستاروں سے زینت دی اور ہر طرح سے اس کی حفاظت کی۔ یہ غالب علم والے کا اندازہ ہے۔'' اور یا نعمائے بہشت کے متعلق ﴿قَوَارِیْرَا۠ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِیْرًا ۝﴾ [الدهر: 16:76] ''شیشے بھی چاندی کے انہوں نے اسے اندازہ سے بنایا ہے۔'' پس تقدیر محض وہ اندازہ ہے جو ہر چیز کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے جس سے وہ آگے نہیں نکل سکتی۔ اور قرآن کریم میں اس لفظ کا استعمال اعمال انسانی کے متعلق قطعاً نہیں ہوا۔ ہاں شقی یا سعید ہونا یہ اللہ تعالیٰ کا علم ہے، اسے تقدیر نہیں کہا جائے گا۔ اور ﴿وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝﴾ میں اسباب کو صاف کر کے بیان کیا گیا ہے کہ ہر چیز کے لیے مادہ ہو یا روح، پتھر ہو یا درخت یا حیوان یا بڑے بڑے اجرام سماوی اللہ تعالیٰ نے ایک اندازہ مقرر کر دیا جس کے اندر وہ شے ترقی کر سکتی ہے۔ اور پھر اسے اس ترقی کی راہیں بھی بتا دی ہیں جس کا ذکر هُدٰی میں ہے۔ اسی طرح انسان کے لیے بھی ایک اندازہ مقرر ہے جس کے اندر وہ ترقی کر سکتا ہے، یہ تقدیر ہے۔ اور وہ اچھے کام کرے گا یا برے کرے گا، یہ اللہ تعالیٰ کے علم کی بات ہے۔

2353- ﴿قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ﴾ سے مراد یہاں وہی لوگ معلوم ہوتے ہیں جن کی طرف کفار اس بات کو منسوب کرتے تھے کہ وہ آپ کو کہانیاں بنا بنا کر دیتے ہیں یعنی بعض نومسلم غلام۔ جیسے عداس، عایش، یسار، جبر وغیرہ۔ ﴿فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا﴾ میں اس کا

وَ قَالُوْۤا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰى عَلَیْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا ۝۵

اور کہتے ہیں پہلوں کی کہانیاں ہیں جو اس نے لکھوائی ہیں، سو وہ اس پر صبح اور شام پڑھی جاتی ہیں۔ (2354)

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝۶

کہہ، اسے اس نے اتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھیدوں کو جانتا ہے، ہاں وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

جواب ہے اس لیے کہ اگر چند کہانیوں سے یہ انقلاب روحانی پیدا ہوسکتا تھا اس کے سنانے والے ہی کر سکتے تھے یا خود یہودی اور عیسائی جو صدیوں تک اس کوشش میں لگے رہے کہ عرب کی اصلاح کریں، وہ ان کہانیوں کے ذریعہ سے کیوں انقلاب پیدا نہ کر سکے۔ پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا طاقتور ہاتھ محمد رسول اللہ ﷺ کی تائید میں کام کر رہا تھا۔ اور جَاءَ اور اَتٰی بمعنی فَعَلَ آتا ہے۔ (ر) اور یا ﴿قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ﴾ سے مراد صرف یہی ہے کہ چند لوگوں نے مل کر یہ افترا بنایا ہے اور کہانیوں کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔

2354- ﴿اكْتَتَبَ﴾۔ [اِكْتَتَبَ فُلَانٌ فُلَانًا] کے معنی ہیں اس سے سوال کیا کہ اس کے لیے ایک تحریر لکھ دے جو کسی حاجت کے لیے ہو اور اس کے معنی محض کتب بھی آتے ہیں۔ (ل) اور اگر لکھنا بھی مراد لیا جائے تو یہ اسناد مجاز کے طور پر ہے۔ کیونکہ یہ ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ خود نہ لکھ سکتے تھے ﴿وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ﴾ [العنکبوت: 48:29] ''اور نہ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا ہے۔'' ﴿تُمْلٰى عَلَیْهِ﴾ سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود نہ پڑھ سکتے تھے۔ ورنہ دوسروں کے پڑھ کر سنانے کا ذکر نہ ہوتا، جس اعتراض کا یہاں ذکر ہے۔ اسی کے قریب قریب ایک جرمن ہرشفیلڈ نے اپنی کتاب نیو ریسرچز یعنی نئی تحقیقات میں لکھا ہے کہ اس کا خیال ہے کہ بائبل کے اس قدر مضامین قرآن شریف کے اندر بھرے ہوئے ہیں کہ ضرور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کتاب کو پڑھ کر ضروری مضامین کے نوٹ اپنے پاس رکھ لیے ہوں اور پھر انہی نوٹوں کو وقتاً فوقتاً قرآن شریف میں داخل کر دیا ہو۔ جو شخص لکھے ہوئے کو پڑھ نہیں سکتا وہ نوٹ کس طرح رکھ سکتا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ ﴿تُمْلٰى عَلَیْهِ﴾ صاف بتاتے ہیں کہ مخالفین نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ یہ خود لکھ لیتا اور پڑھتا رہتا ہے۔ بلکہ دوسروں سے لکھواتا اور پھر دوسروں سے پڑھوا کر سنتا ہے۔ پس جرمن پروفیسر کے خیال کو تاریخ باطل کرتی ہے۔ اور جو اعتراض اس وقت مخالفین نے کیا اس کا جواب یہی کافی ہے کہ جو لوگ کہانیاں اس طرح لکھ کر دیتے اور سناتے تھے وہ آنحضرت ﷺ پر ایمان کیونکر لا سکتے تھے اور ایمان بھی تمام دنیا کے مصائب کے مقابلہ میں۔ اس لیے کہ انہی لوگوں کو یعنی بالخصوص غلاموں کو سخت سے سخت مظالم کا تختہ مشق بنایا گیا۔ اور دوسرا جواب اگلی آیت میں دیا ہے کہ اس قرآن میں ایسی اسرار کی باتیں ہیں جنہیں انسان نہیں جان سکتا۔ پس یہ بناوٹی بات کس طرح ہوسکتی ہے۔

وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ﴿۷﴾

اور کہتے ہیں یہ کیسا رسول ہے (جو) کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیوں اس کی طرف فرشتہ نہ اتارا گیا تو وہ اس کے ساتھ ہو کر ڈرانے والا ہوتا۔[2355]

اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۸﴾

یا اس کی طرف خزانہ بھیجا جاتا یا اس کا باغ ہوتا جس سے وہ کھاتا۔ اور ظالم کہتے ہیں کہ تم صرف ایک سحر والے آدمی کی پیروی کرتے ہو۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹﴾ ع 1 9 16

دیکھ تیرے لیے کیسی مثالیں بیان کرتے ہیں۔ سو وہ گمراہ ہو گئے ہیں، پس رستہ نہیں پا سکتے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْۤ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ يَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ﴿۱۰﴾

وہ (ذات) بابرکت ہے جو اگر چاہے تو تجھے اس سے بہتر باغ دے دے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں اور تجھے محل دے دے۔[2356]

2355- بازاروں میں چلنے پھرنے سے مراد معاش کے لیے کام کرنا ہے۔

2356- اعتراض یہ تھا کہ رسول ہے تو ہماری طرح کیوں معاش کے لیے چلتا پھرتا اور کام کاج کرتا ہے، کیوں اس کے پاس خزانہ خدا کی طرف سے نہیں آجاتا یا وہ آخرت میں جنات کے وعدے دیتا ہے تو اسے یہیں کوئی باغ کیوں نہیں مل جاتا، جس کی وجہ سے فکر معاش سے سبکدوش ہو جائے۔ پہلے حصہ کا جواب اس رکوع کی آخری آیت میں دیا اور دوسرے حصہ کا جواب یہاں ہے۔ ﴿خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ﴾ سے مراد ہے اس سے بہتر جو ان کے خیال میں ہے۔ اور جنات اور قصور سے مراد اس دنیا کے جنات اور قصور ہیں۔ [إِنْ شَآءَ وَهَبَ لَكَ فِي الدُّنْيَا شَيْئًا خَيْرًا لَّكَ مِمَّا اقْتَرَحُوْهُ وَهُوَ أَنْ يَّجْعَلَ لَكَ مِثْلَ مَا وَعَدَكَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْجَنَّاتِ وَالْقُصُوْرِ] (ر) اور سوال کرنے والوں کے دل میں یا تو شاید مکہ یا زیادہ سے زیادہ طائف کے کچھ باغ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عرب کے باغوں کے ساتھ عراق اور شام اور ایران کے باغوں کا مالک بھی بنا دیا، اور شام اور ایران کے محلات اور خزانے سب آپؐ کے ادنیٰ خادموں کے قدموں میں لا کر ڈال دیئے۔ جنگ خندق میں نبی کریم ﷺ کو قیصر اور کسریٰ اور صنعاء کے محل دکھائے گئے اور آپ کو خبر دی گئی کہ ان کے مالک آپ ہوں گے۔ اور خزانوں کی تو

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۫ وَ اَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ﴿۱۱﴾

بلکہ وہ مقرر گھڑی کو جھٹلاتے ہیں اور ہم نے اس شخص کے لیے جو مقرر گھڑی کو جھٹلائے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کی ہے۔ (2357)

اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّ زَفِيْرًا ﴿۱۲﴾

جب وہ انہیں دور کے مکان سے دیکھے گی تو وہ اس کے جوش وخروش کو سنیں گے۔

وَ اِذَاۤ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾ؕ

اور جب وہ اس کی تنگ جگہ میں جکڑے ہوئے ڈالے جائیں گے تو وہاں ہلاکت کو پکاریں گے۔ (2358)

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّ ادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۴﴾

آج ایک ہلاکت کو نہ پکارو اور بہت سی ہلاکتوں کو پکارو۔ (2359)

یہ حالت تھی کہ ایک ادنیٰ صحابی سراقہ کے ہاتھ میں کسریٰ کے سونے کے کڑے ایک پیشگوئی کو پورا کرنے کے لیے پہنائے گئے۔ پس بتادیا کہ جس فرقان کے تم طالب ہو وہ بھی ظاہر کر دیا جائے گا مگر اپنے وقت پر۔

2357- ﴿السَّاعَةِ﴾ سے مراد قیامت بھی ہوسکتی ہے اور ان کی اپنی ساعت بھی۔ دوسری صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ یہ لوگ جو رسول کے ارتداد کو جھوٹا ٹھہرا کر اس خیال میں بیٹھے ہیں کہ وہ کبھی مغلوب نہ ہوں گے ان کے لیے نہ صرف وہ وعدہ مغلوبیت ہی پورا ہو کر رہے گا بلکہ آخر کار جلتی ہوئی آگ میں بھی داخل ہوں گے۔ یعنی وعدہ آخرت بھی پورا ہوگا۔ صورت اول میں مراد یہ ہے کہ جو لوگ جزا وسزا کی تکذیب کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے افعال شنیعہ پر دلیل ہو جاتے ہیں، اس لیے آخرت میں ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔

2358- ﴿مُّقَرَّنِيْنَ﴾۔ قَرن دو چیزوں کو جمع کرنا ہے اور قرّن تکثیر کے لیے ہے۔ (غ) اور دوسری جگہ ہے ﴿مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ﴾ [إبراهيم: 49:14] ''زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔'' پس یہاں بھی مراد زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس دنیا کی خواہشات کی زنجیریں آخرت کی زنجیریں بن جاتی ہیں۔

2359- ان کا ہلاکت کو پکارنا اس طرف اشارہ ہے جو دوسری جگہ فرمایا ﴿لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ﴾ [الزخرف: 77:43] ''تیرا رب ہمارا کام تمام کر دے۔'' یعنی ان کا کام تمام ہو جائے۔ گویا خود ہلاکت کی خواہش کریں گے۔ اس کے جواب میں فرمایا ایک ہلاکت

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّ مَصِيْرًا ﴿۱۵﴾

کہہ، کیا یہ بہتر ہے یا ہمیشگی کا باغ جس کا متقیوں کو وعدہ دیا جاتا ہے۔ وہ ان کے لیے بدلہ اور آخری ٹھکانہ ہوگا۔

لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴿۱۶﴾

ان کے لیے جو چاہیں گے اس میں ہوگا (اسی میں) رہیں گے۔ یہ تیرے رب کے ذمے مانگے جانے کے قابل وعدہ ہے۔ (2360)

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰۤؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۱۷﴾

اور جس دن وہ انہیں اکٹھا کرے گا اور ان کو (بھی) جس کی وہ اللہ کے سوائے بندگی کرتے ہیں، پھر کہے گا کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا وہ خود رستہ سے بہک گئے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَ كَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۸﴾

کہیں گے تو پاک ہے، ہمارے لیے یہ شایاں نہ تھا کہ تیرے سوائے اور کارساز بناتے لیکن تو نے انہیں اور ان کے باپ دادوں کو سامان دیا یہاں تک کہ وہ ذکر کو بھول گئے اور وہ ہلاک ہونے والی قوم تھے۔ (2361)

کیا بیسیوں قسم کی ہلاکتوں کے سامان تم نے کر رکھے ہیں، ان سبھی کو بلاؤ۔

2360- ﴿مَّسْـُٔوْلًا﴾ سے مراد ہے اس قابل کہ مانگا جائے۔ ابن زید کا قول ہے جس کے متعلق انہوں نے دنیا میں سوال کیا یعنی اسے طلب کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دیا۔ (ج)

2361- تَبُوْرَ۔ بَوَار کساد یعنی سرد بازاری کا بہت ہو جانا ہے۔ اور چونکہ اس کا نتیجہ فساد ہے اس لیے بَوَار کے معنی ہلاکت ہو گئے ہیں۔ ﴿تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ﴾ [فاطر: 29:35] ''ایسی تجارت جو تباہ نہیں ہوگی۔'' ﴿وَ مَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ۝﴾ [فاطر: 10:35] ''اور ان کی مخفی تدبیر ملیا میٹ ہو جائے گی۔'' ﴿وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ﴾ [ابراهيم: 28:14] ''اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں

فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿۱۹﴾

سو انہوں نے تم کو اس میں جھٹلایا جو تم کہتے ہو۔ سو نہ تم (عذاب کو) پھیر سکو گے اور نہ مدد (پا سکو گے) اور جو کوئی تم میں سے ظلم کرے ہم اسے بڑا عذاب چکھائیں گے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۰﴾ ع

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجے مگر وہ یقیناً کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔ اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے۔ کیا تم صبر کرو گے؟ اور تیرا رب دیکھنے والا ہے۔ (2362)

اتارا'' اور اکیلے آدمی کو حَائِر بَائِر اور قوم کو حُوْر بُوْر کہا جاتا ہے۔ (غ)

﴿مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ سے مراد یہاں ایسے لوگ ہیں جن کو خدا بنایا گیا جیسے مسیح وغیرہ۔ ان کا انکار یہ بتانے کے لیے ہے کہ کبھی کسی راستباز نے دنیا میں یہ تعلیم نہیں دی کہ اسے خدا سمجھا جائے۔

2362- اس میں اس اعتراض کا جواب دیا ہے جو پہلے رکوع کے آخر پر تھا کہ یہ رسول کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہی سنت اللہ ہے کہ انسانوں کے لیے انسان ہی رسول ہو کر آئے۔ جہاں کہاں دنیا میں مصلح آئے ایسے ہی آئے۔ بعض کو بعض کے لیے فتنہ بنانے سے مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو تکلیفیں نیکوں کو پہنچائی جاتی ہیں وہ ان کو اعلیٰ مراتب پر پہنچانے کے لیے ہیں۔ کیونکہ فتن سونے کو آگ میں ڈالنا ہے تاکہ ہر قسم کی میل سے پاک ہو جائے۔ اسی لیے اس کے بعد فرمایا کہ تم صبر کرو، اللہ تعالیٰ نتیجہ تمہارے حق میں کرے گا۔ کیونکہ وہ بصیر ہے تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔